ایمانی شہ پارے

مرتب

ساحر لکھنوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آثار و افکار اکادمی (پاکستان)

کی دوسری قابلِ فخر پیشکش

ایمانی شہ پارے

مشاورت

جناب سید محمد احفاد، جناب حسین انجم

ترتیب و تعارف

ساحر لکھنوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

بابِ مدینۃ العلم، خطیبِ منبرِ سلونی، صاحبِ نہج البلاغہ، عالمِ علمِ لدنی، سرچشمۂ علومِ ربانی، کاشفِ اسرارِ قرآنی:

مولائے جاں، رسولِ تمدن، الٰہِ علم

امیر المومنین حضرتِ علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کی بارگاہِ اقدس میں

بصد عجز و نیازِ غلامانہ:

گر قبول افتد زہے عز و شرف

کوائفِ کتاب

آثار وافکار اکادمی (پاکستان)

کی دوسری فخریہ پیشکش

نام کتاب	:	ایمانی شہ پارے
موضوع	:	علمی اور دینی مضامین
مصنف	:	مختلف اہل علم
مرتب	:	سید قائم مہدی ساحر لکھنوی
مشاورت	:	جناب سید احمد احفاد ایڈوکیٹ
		جناب حسین انجم مدیر مسئول ماہنامہ طلوع افکار کراچی
کمپوزنگ	:	جاوداں کمپوزرز
طباعت	:	کمیونیکیٹرز
قیمت	:	ساٹھ روپے
سنِ اشاعت	:	۱۴۱۹ھ، مطابق ۱۹۹۸ء
مہتممِ اشاعت	:	جناب حسین انجم
		جناب آغا شکیل حسین

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اکادمی اور یہ کتاب

ایک مختصر تعارف

ساحر لکھنوی

اب سے ایک سال پہلے مارچ ۱۹۹۷ء میں کچھ نہایت مخلص، علم دوست اور دردمند دل رکھنے والے حضرات نے کراچی میں "آثار و افکار اکادمی (پاکستان)" کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی تھی۔

اس ادارے کی تشکیل کا سبب کچھ ایسے افسوس ناک حقائق تھے جن سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ ملتِ جعفریہ کے اہلِ علم اور اہلِ قلم کی پذیرائی کسی سطح پر بھی نہیں کی جاتی اور اکثر ان کے علمی کارنامے بھی تعصبات کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ یہ رویہ اہلِ علم کی ہمت شکنی کا باعث ہوتا ہے اور علم کی راہ میں ان کے قلم کی روانی کے آگے دیوار بن جاتا ہے۔ اس طرح قلم کی جولانیاں رک جاتی ہیں، فکری دھارے دم توڑ دیتے ہیں اور بالآخر فروغ علم کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف خود ملت کے افراد میں نہ تو فروغ علم کا کوئی جذبہ ہے، نہ اس کے پاس کوئی ایسا ادارہ ہے جو اپنے اہلِ علم و اہلِ قلم کی ہمت افزائی کرنے اور فروغ علم کے لیے تمام ممکنہ اقدامات کرنے میں سعی بلیغ کرے۔

اس پس منظر میں آثار و افکار اکادمی کا قیام عمل میں آیا جس کے اغراض و

مقاصد میں عمومی فلاحی کاموں کے علاوہ فروغ علم اور اس کے سلسلے میں حسبِ ذیل مقاصد خصوصی اور بنیادی اہمیت اور ترجیحات کے اعتبار سے سرِ فہرست ہیں:

۱) ملتِ جعفریہ کے اہلِ علم اور اہلِ قلم کی ہمت افزائی کے لیے سال کی بہترین کتابوں پر نقد انعامات دینا۔

۲) جو اہلِ علم و اہلِ قلم مالی مسائل کی وجہ سے اپنی تخلیقات کی اشاعت کا سارا بوجھ خود برداشت نہیں کر سکتے، ان کی کتابوں کی اشاعت میں مدد دینا۔

۳) علمائے سلف کی ان کتابوں کی اشاعت کی کوشش کرنا جو اب تک کسی وجہ سے شائع نہیں ہو سکیں یا اب دستیاب نہیں ہیں مگر وقت کا تقاضا ہے کہ ان کی اشاعت کا بندوبست کیا جائے۔

۴) رسائل و جرائد کسی بھی قوم کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، مگر قوم کی غفلت کی وجہ سے وہ بھی مالی مسائل سے عموماً دوچار رہتے ہیں اور اکثر ان کی اشاعت جاری رکھنا ممکن نہیں ہوتا، لہٰذا ان کے خدمات کے اعتراف میں نقد رقوم سے ان کی ہمت افزائی کرنا۔

۵) اس کے علاوہ بھی ہر ممکن طریقے سے فروغ علم کی کوشش کرنا۔

اب تک قوم کے پاس کوئی ایسا ادارہ نہیں تھا جس کے اغراض و مقاصد میں مندرجۂ بالا نکات شامل ہوں۔ یہ بات ہمارے لیے یقیناً باعثِ فخر ہے کہ خدا کے فضل سے ہم نے اس سمت میں پہلا قدم اٹھایا ہے اور ان مقاصد کے حصول میں پہل کی ہے اور ہمیں یقینِ کامل ہے کہ ہمارے خلوصِ نیت، عزمِ بالجزم اور جذبے کی صداقت کو دیکھتے ہوئے انشااللہ مولاؑ کے کرم اور قوم کے تعاون سے ہم کو اپنے مشن اور مقاصد میں شاندار کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں گی۔

اکادمی کے قیام کو ابھی ایک ہی سال ہوا ہے۔ کسی ادارے کے قیام، اس کے تنظیمی امور کی تکمیل اور حصولِ مقاصد میں پیش رفت کے لیے ایک سال کی مدت کافی نہیں ہوتی۔ پھر بھی خدا کے فضل اور مولاؑ کے کرم سے ہم نے اس مدت میں اتنی

پیش رفت کی کہ ۱۴۱۸ھ میں شائع ہونے والی کتابوں پر انعامات دینے کا اعلان بھی کر دیا اور اکادمی کی طرف سے یہ کتاب بھی آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

ہم نے اکادمی کی طرف سے یہ اعلان بھی کیا کہ جو اہلِ قلم اپنی کتابوں کی اشاعت میں اکادمی کا تعاون چاہتے ہوں، وہ ہم سے رجوع کریں۔اس کے جواب میں ملک کے مختلف علاقوں سے ہمارے پاس تعاون کے لیے خطوط آنا شروع ہو گئے، مگر چونکہ ابھی تک اشاعت کے لیے کسی مسودے کا انتخاب نہیں کیا جا سکا، اس لیے ادارے کی مجلسِ منتظمہ اور مجلسِ مشاورت نے یہ طے کیا کہ اکادمی کی طرف سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی جائے جس میں ایسے مضامین شامل کیے جائیں جو نہ صرف علمی، ادبی اور دینی اعتبار سے افادیت کے حامل ہوں بلکہ اپنے اعلیٰ معیار اور بلند پایہ تحقیقی کام کی وجہ سے بھی بہت اہم ہوں۔اس غرض سے ہم نے اس کتاب کے لیے جن مضامین کا انتخاب کیا، ان میں اسنادِ نہج البلاغہ پر اپنے وقت کے عظیم مجتہد سید العلماءؒ علامہ سید علی نقی النقوی سابق صدرِ شعبۂ شیعہ دینیات اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا عظیم الشان تحقیقی مقالہ سرِفہرست ہے۔اس مقالے میں جناب سید العلماءؒ نے روایت و درایت، ہر اعتبار سے خطباتِ نہج البلاغہ کو مولائے کائنات بابِ مدینۃ العلم اور خطیبِ منبرِ سلونی جناب علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہی کا کلام ہونا ایسے مضبوط تاریخی اور منطقی دلائل سے ثابت کیا ہے جن کو رد کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔اس طرح انھوں نے ان علمائے اسلام کے اس قول کو باطل کر دیا کہ نہج البلاغہ حضرتِ علیؑ کا کلام نہیں ہے بلکہ سید شریف رضیؒ نے اپنی طرف سے خطبات لکھ کر ان کے نام سے منسوب کر دیے۔یہ سید العلماء کا ایسا عظیم الشان تحقیقی کارنامہ ہے جس کے آگے پی ایچ۔ڈی کے اکثر تحقیقی مقالے ابتدائی درجوں کے طالبانِ علم کی تحریریں معلوم ہوتے ہیں۔

قوم کے ہر فرد کو عموماً اور نوجوانوں کو خصوصاً اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے جس سے ان کے علم میں اضافہ ہوگا، معلومات میں وسعت پیدا ہوگی اور اس کے

ساتھ ہی ذہن روشن، فکر وسیع، اعتقاد پختہ اور ایمان تازہ ہوگا۔

اس کے علاوہ سید العلماءؒ کے تین اور مضامین

۱) حضرتِ علیؑ کی شخصیت...... علم اور اعتقاد کی منزل میں

۲) حقیقتِ اسلام

۳) اسلامی نظریۂ حکومت

بھی اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ یہ مضامین مختصر مگر نہایت جامع اور بہت اہم ہیں۔ سید العلماءؒ کی تحریروں کی ایک بہت نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہایت وسیع موضوع کو سمیٹ کر نہایت مختصر لفظوں میں اس حسن وخوبی سے بیان کر دیتے ہیں کہ اختصار کے باوجود نفسِ مضمون بالکل واضح ہو جاتا ہے اور قاری کے لیے کوئی نکتہ مبہم یا گنجلک نہیں رہتا، گویا وہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ ان کے چار صفحوں کے مضمون میں اتنے نکات ہوتے ہیں کہ اگر کوئی ان کو پھیلا کے لکھنا چاہے تو چالیس صفحے کا کتابچہ تیار ہونا کچھ مشکل نہیں۔ مندرجۂ بالا تینوں مضامین مختصر ہونے کے باوجود اپنے اپنے موضوعات کے اعتبار سے اتنے اہم ہیں کہ عہدِ موجود کے متعلقہ مسائل کے تناظر میں ان کا مطالعہ ذہنوں میں ابھرنے والے بہت سے سوالات کے واضح جوابات مہیا کر دے گا اور اسلام سے متعلق بہت سے وسوسوں کو دور کر کے عقیدہ و اعتقاد کو مستحکم کرے گا بلکہ فکر ونظر کو معانی کی ایک نئی دنیا سے روشناس کرائے گا۔

سید العلماءؒ کے ان مضامین کے علاوہ "اسلام اور طبقاتی نظام" کے موضوع پر رئیس العلماءؒ جناب سید کاظم نقوی صاحب قبلہ مدظلہٗ کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔ اس مضمون کی اہمیت اس کے عنوان ہی سے ظاہر اور موجودہ دور کی طبقاتی کشمکش کے پس منظر میں اس کا مطالعہ موضوع کے متعلق اسلام کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور سمجھانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ مولانائے محترم نے موضوع پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے اور ایک پیچیدہ موضوع کو نہایت آسان لفظوں میں واضح کیا ہے۔ مولانا سید

کاظم نقوی صاحب قبلہ بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شیعہ دینیات کے سربراہ اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی کی حیثیت سے ماضی قریب میں ریٹائر ہوئے ہیں ۔ سید العلماً کی طرح وہ بھی ایک جلیل القدر عالمِ دین اور صاحبِ قلم ہیں ۔ اس مضمون کا مطالعہ ہی قارئین پر یہ حقیقت آشکار کر دے گا۔

اس کے پہلو بہ پہلو " غدیرِ خم " کے موضوع پر عہدِ حاضر کے ایک نہایت صاحبِ علم شاعر اور ادیب جناب پروفیسر سید مظفر حسن صاحب ظفر جون پوری کا ایک مضمون بھی اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے ۔ حضرتِ ظفر جون پوری شعبۂ معارفِ اسلامی ، کراچی یونیورسٹی کے سابق استاد ہیں ۔ وہ نہایت اعلیٰ پائے کے مرثیہ نگار اور مداحِ محمدؐ و آلِ محمدؐ ہونے کے ساتھ اسلامی مضامین خصوصاً فقہ، حدیث و تاریخ پر بہت گہری نظر رکھتے ہیں اور ان موضوعات پر تحقیقی مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں ۔ غدیرِ خم کے موضوع پر ان کا یہ مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔ غدیر ملتِ جعفریہ کے لیے ایک نہایت اہم اور حد درجہ پسندیدہ موضوع ہے ۔ اس مختصر مضمون میں فاضل مضمون نگار نے غدیر کے واقعے کی تفصیلات ایجازاً بیان کرنے کے علاوہ اس حقیقت پر خاص طور سے روشنی ڈالی ہے کہ اہلِ سنت کے کوئی ساڑھے تین سو علماً نے واقعۂ غدیر کو روایت کیا ہے جس کے بعد اس سے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔ انھوں نے صدی بہ صدی ان راویانِ واقعۂ غدیر کی تعداد بھی بیان کی ہے ۔ اس مضمون کا مطالعہ بھی انشااللہ مومنین کے دل و دماغ کو فرحت اور ایمان کو تازگی بخشے گا۔

ہمیں یقین ہے کہ اپنے مضامین کی اہمیت، افادیت اور اعلیٰ معیار کی وجہ سے یہ کتاب انشااللہ ملتِ جعفریہ کے ہر طبقے میں مقبولیت حاصل کرے گی اور ان چھوٹے چھوٹے مگر اعلیٰ درجے کے علمی اور تحقیقی مضامین کے مطالعے سے افرادِ ملت ، خصوصاً نوجوانوں میں مطالعے کا شوق پیدا ہوگا جو اس ادارے کا بنیادی مقصد ہے ۔

ہم نے اس کتاب کی ضخامت کو ممکنہ حد تک کم رکھنے کی کوشش کی ہے ، اس لیے کہ

۱) ضخیم کتابوں کے مطالعے کی طرف کوئی مائل نہیں ہوتا۔ بیشتر لوگ کتاب کی ضخامت دیکھ کر ہی گھبرا جاتے ہیں اور بھاری پتھر سمجھ کر اسے چوم کے چھوڑ دیتے ہیں۔

۲) ضخیم کتابوں کی قیمت بھی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اکثر حضرات کے لیے ان کا خرید نا ممکن نہیں ہوتا۔ کم ضخامت کی کتاب کی قیمت بھی کم ہوتی ہے، اس لیے زیادہ سے زیادہ لوگ اسے آسانی سے خرید سکتے ہیں۔

۳) اکادمی مومنین کو اس پر بھی آمادہ کرنا چاہتی ہے کہ جہاں وہ مجالسِ عزا میں تبرک پر ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں، وہیں دس بیس کتابیں بھی خرید کر اپنے ان سامعین میں تبرکاً تقسیم کر دیا کریں جو کتاب کا مطالعہ کر سکتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے کتاب کی قیمت کا کم ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اکادمی نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ جو حضرات مجالس میں تقسیم کرنے کے لیے یہ کتاب یا اکادمی کی آئندہ کتابیں خریدنا چاہیں گے، ان کو براہِ راست اکادمی سے خریداری پر کتاب پچیس فی صد کم قیمت پر فراہم کی جائے گی، بشرطیکہ بیک وقت کتاب کی کم از کم دس جلدیں خریدی جائیں۔

امید ہے کہ اکادمی کا یہ پروگرام قوم میں پذیرائی حاصل کرے گا اور اس طرح فروغِ علم کے سلسلے میں ہم ایک اہم پیش رفت کر سکیں گے۔

ملتِ جعفریہ کے ہر فرد سے ہماری اپیل ہے کہ اکادمی کے مقاصد کے حصول میں ہماری مدد اور معاونت فرمائیں اس طرح کہ

۱) ہر گھر سے کم سے کم ایک فرد اکادمی کا رکن بنے۔ زرِ رکنیت ایک ہزار روپے سالانہ یا سو روپے ماہوار ہے۔

۲) عزاداری کے لیے رقوم مختص کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا کم از کم دس فی صد فروغِ علم کے اس عظیم مقصد کے لیے بھی مختص کیجیے اور وہ رقم عطیے کے طور پر اکادمی کو دیجیے۔

۳) تبرک کے ساتھ اکادمی کی کچھ کتابیں بھی خرید کر تبرکاً تقسیم کیجیے۔

۴) اکادمی کو زیادہ سے زیادہ عطیات دے کر اس کو مستحکم کیجیے تاکہ ہم فروغ علم کے لیے انعامات، کتابوں کی اشاعت اور دیگر ترغیبات کو زیادہ سے زیادہ پرکشش بنا کر اپنے اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

اب آپ کتاب کا مطالعہ کیجیے اور اس کے بعد اگر کوئی تعمیری تجویز آپ کے ذہن میں آئے تو اس سے ہم کو مطلع فرمائیے۔ شکریہ!

مقدمۂ نہج البلاغہ

از

حجۃ الاسلام سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء
والمرسلین والہ الطیبین الطاہرین

نہج البلاغہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام کا وہ مشہور ترین مجموعہ ہے جسے جناب سید رضی برادر شریف مرتضیٰ علم الہدیٰ نے چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں مرتب فرمایا تھا۔ اس کے بعد پانچویں صدی کے پہلے عشرے میں آپ کا انتقال ہو گیا ہے اور نہج البلاغہ کے اندازِ تحریر سے پتہ یہ چلتا ہے کہ انھوں نے طویل جستجو کے ساتھ درمیان میں خالی اوراق چھوڑ کر امیر المومنین کے کلام کو متفرق مقامات سے یک جا کیا تھا جس میں ایک طویل مدت صرف ہوئی ہوگی اور اس میں اضافے کا سلسلہ ان کے آخرِ عمر تک قائم رہا ہوگا، یہاں تک کہ بعض کلام جو کتاب کے یک جا ہونے کے بعد ملا ہے، اس کو تعجیل میں انھوں نے اس مقام کی تلاش کیے بغیر جہاں اسے درج ہونا چاہیے تھا، کسی اور مقام پر شامل کر دیا ہے اور وہاں یہ لکھ دیا ہے کہ یہ کلام کسی اور روایت کے مطابق اس کے پہلے کہیں درج ہوا ہے۔ یہ اندازِ جمع و تالیف خود ایک غیر جانب دار شخص کے لیے یہ پتہ دینے کے واسطے کافی ہے کہ اس میں خود سید رضی کے ملکۂ انشا اور قوتِ تحریر کا کوئی دخل نہیں

ہے، بلکہ انھوں نے صرف مختلف مقامات سے جمع آوری کر کے امیر المومنینؑ کے کلام کو یک جا کر دینے پر اکتفا کی ہے۔ یہ پاشانی اور پریشانی حسب بحیثیت تالیف کے کتاب کا ایک نقص سمجھنا چاہیے، مقامِ اعتبار میں اس پر اعتماد پیدا کرنے والا ایک جوہر ہو گیا ہے۔ انھوں نے مختلف نسخوں اور مختلف راویوں کی یادداشت کے مطابق نقلِ الفاظ میں اتنی احتیاط کی ہے کہ بعض وقت دیکھنے والے کے ذوق پر بار ہو جاتا ہے کہ اس عبارت کے نقل کرنے سے فائدہ ہی کیا ہوا جبکہ ابھی ابھی ہم ایسی ہی عبارت پڑھ چکے ہیں جیسے ذم اہل بصرہ میں اس شہر کے غرقابی کے تذکرے میں اس کی مسجد کا نقشہ کھینچنے میں مختلف عبارات کبھی نعامة جاثمة اور کبھی کجوء جوء طیر فی لجة بحر اور اس سے ملتے جلتے ہوئے اور الفاظ، یہ اسی طرح کا اہتمام صحتِ نقل میں ہے جیسے موجودہ زمانے میں اکثر کتابوں کی عکسی تصویر شائع کی جاتی ہے جس میں اغلاطِ کتابت تک کی اصلاح نہیں کی جاتی اور صرف حاشیے پر لکھ دیا جاتا ہے کہ بظاہر یہ لفظ غلط ہے، صحیح اس طرح ہونا چاہیے۔ دیکھنے والے کا دل تو ایسے مقام پر یہ چاہتا ہے کہ اصل عبارت ہی میں غلط کو کاٹ کر صحیح لفظ لکھ دی گئی ہوتی، مگر صحتِ نقل کے اظہار کے لیے یہ صورت اختیار کی جایا کرتی ہے، جیسے قرآن مجید میں بعض جگہ تالیفِ عثمانی کے کاتب نے جو کتابت کی غلطیاں کر دی تھیں جیسے لاذبحنه میں لا کے بعد ایک الف جو یقیناً غلط ہے، اس لیے کہ یہ لائے نافیہ نہیں جس کے بعد اذبحنه فعل آئے بلکہ لام تاکید ہے جس سے اذبحنه فعل متصل ہے، مگر اس قسم کے اغلاط کو بھی دور کرنا بعد کے مسلمانوں نے صحتِ نقل کے خلاف سمجھا۔ اسی طرح املائے قرآن گویا ایک تعبدی شکل سے معین ہو گیا۔ بعض جگہ رحمة کی ت لمبی لکھی جاتی ہے، بعض جگہ جنّٰت بغیر الف کے لکھا جاتا ہے۔ بعض جگہ یدعو ایسے فعلِ واحد میں بھی وہ الف لکھا ہوا ہے کہ جو جمع کے بعد غیر ملفوظی ہونے کے باوجود لکھا جایا کرتا ہے۔ ان سب خصوصیات کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے جس سے مقصود وثاقتِ نقل میں قوت پیدا کرنا ہے۔ اسی طرح علامہ سید رضی نے جس شکل

میں جو فقرہ دیکھا، اس کو درج کرنا ضروری سمجھا تاکہ کسی قسم کا تصرف کلام میں ہونے نہ پائے۔ یہ ایک روایتی پہلو ہے جو اس تصور کو بالکل ختم کر دیتا ہے کہ یہ کتاب سید رضی رحمۃ اللہ کی تصنیف کی حیثیت رکھتی ہو۔

دوسرا پہلو خطبوں کے درمیان کے ومنا....... ومنہ ہیں جس میں عموماً بعد کا حصہ قبل سے بالکل غیر مربوط ہوتا ہے، بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ قبل کا حصہ قبل بعثت سے متعلق ہے یا اوائل بعثت سے اور بعد کا حصہ بعدِ وفاتِ رسولؐ سے متعلق ہے۔ یہ بھی دیکھنے والے کے ذوق پر بار ہو جایا کرتا ہے، مگر اس سے بھی اس مقصد کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اگر سید رضی کا کلام ہوتا تو فطری طور پر اس میں تسلسل ہوتا یا اگر انھیں دو موضوعوں پر لکھنا ہوتا تو اسے وہ دو خطبوں میں مستقل طور پر تحریر کرتے، لیکن وہ کیا کرتے جبکہ انھیں کلامِ امیرالمومنینؑ ہی کا انتخاب پیش کرنا تھا اس لیے جہاں خطبے کا پہلا جز اور آخر کا جز دو مختلف موضوعوں سے متعلق ہے اور درمیان کا حصہ کسی وجہ سے وہ درج نہیں کر رہے ہیں تو نہ وہ اس کو کلامِ واحد بنا سکتے ہیں، نہ مستقل دو خطبے، بلکہ انھیں ایک ہی کلام میں ومنہا کے فاصلے قائم کرنا پڑتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ شکل بعض جگہ تو انتخاب کی وجہ سے ہوئی ہے اور بعض جگہ یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ سابق میں قلمی کتابوں کے سوا کوئی دوسری شکل مواد کے فراہم ہونے کی نہ ہوتی تھی اور قلمی کتابوں کے اکثر نسخے منحصر بفرد ہوتے تھے اب اگر ان میں درمیان کا حصہ کرم خوردہ ہو گیا ہے یا اوراق ضائع ہو گئے ہیں یا رطوبت سے روشنائی پھیل جانے کی وجہ سے وہ ناقابلِ قرأت ہے تو علامہ سید رضی اس موقع پر درمیان کا حصہ نقل کرنے سے قاصر رہے ہیں اور حرص جمع و حفاظت میں انھوں نے اس کے قبل یا بعد یا وسط کے وہ سطور تلاش کیے ہیں جو کسی مستقل مفاد کے حامل ہیں اور اس طرح درمیان کے حصوں میں انھوں نے ومنہا کہہ کر اس کے درج کرنے سے عاجزی ظاہر کی ہے۔ یہ بھی ہے کہ اس وقت علم کا ایک بڑا ذخیرہ حفاظ و ادبا و محدثین کے سینوں میں ہوتا تھا۔ فرض کیجیے کسی لپنے استاد اور شیخ

حدیث سے علامہ سید رضی نے کسی موقع کی مناسبت سے خطبے کا ابتدائی حصہ سن لیا اور انھوں نے اسے فوراً قلم بند کرلیا، پھر دوسرے موقع پر انھوں نے ان کی زبان سے اسی خطبے کے کچھ دوسرے فقرات سنے اور انھیں محفوظ کرلیا اور اتنا موقع نہ مل سکا کہ درمیانی اجزا ان سے دریافت کر کے لکھتے۔ اس طرح انھوں نے اس کی خانہ پری و مہنا کے ذریعے سے کی۔ یہ بھی اس کی دلیلِ قوی ہے کہ انھوں نے اصل کلامِ امیرالمومنینؑ کے ضبط و حفظ ہی کی کوشش کی ہے، قطعاً کوئی تصرف خود نہیں کرنا چاہا۔

تیسرا شاہد اس کا خود جناب رضی کے وہ مختصر تبصرے ہیں جو کہیں کہیں کچھ خطبوں کے بعد انھوں نے اس کلام کے متعلق اپنے احساسات و تاثرات کے اظہار پر مشتمل درج کر دیے ہیں یا بعض جگہ کچھ الفاظ کی تشریح ضروری سمجھی ہے۔ ان تبصروں کی عبارت نے ان خطبوں سے متصل ہو کر ہر صاحبِ ذوق عربی داں کے لیے یہ اندازہ قطعی طور پر آسان کر دیا ہے کہ ان تبصروں کا انشا پرداز وہ ہرگز نہیں ہوسکتا جو ان خطبوں کا انشا پرداز ہے، جس طرح خود علامہؒ رضی نے اپنی مایۂ ناز تفسیرِ حقائق التزیل میں اعجازِ قرآن کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ باوجودیکہ امیرالمومنینؑ کا کلام جو فصاحت و بلاغت میں مافوق البشر ہے، مگر جب خود حضرت کے کلام میں کوئی قرآن کی آیت آجاتی ہے تو وہ اس طرح چمکتی ہے جس طرح سنگ ریزوں میں گوہرِ شاہ وار۔ بالکل اسی شکل سے اگرچہ علامہ سید رضی اپنے دور کے افصحِ زمانہ تھے اور ادبِ عربی میں معراج کمال پر فائز تھے، مگر نہج البلاغہ میں امیرالمومنینؑ کے کلام کے بعد جب ان کی عبارت آجاتی ہے تو ہر دیکھنے والا محسوس کرتا ہے کہ اس کی نگاہ بلندیوں سے گر کر نشیب میں پہنچ چکی ہے، حالانکہ ان عبارتوں میں علامہ سید رضی نے ادبیت صرف کی ہے اور اپنی حد بھر اپنی قابلیت دکھائی ہے، مگر سابق کلام کی بلندی کو ہر مطالعہ کرنے والے کے لیے ایک امرِ محسوس کی حیثیت سے ظاہر کر دیا، یہ بھی ایک بہت بڑا داخلی شاہد ہے۔ اس تصور

کے غلط ہونے کا وہ علامہ سید رضی کا کلام ہو۔

چوتھا امر یہ ہے کہ جناب سید رضی اپنے دور کے کوئی گمنام شخص نہ تھے۔ وہ دینی و دنیوی، دونوں قسم کے ذمے دار منصبوں پر فائز تھے۔ یہ دور بھی وہ تھا جو مذہب و ملت کے علماً و فضلا سے بھرا ہوا تھا۔ بغداد سلطنتِ عباسیہ کا دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے مرکزِ علم و ادب بھی تھا۔ خود سید رضی کے استاد شیخ مفید بھی نہج البلاغہ کے جمع و تالیف کے دور میں موجود تھے، اس لیے کہ جناب شیخ مفید علامہ سید رضی کی وفات کے بعد تک موجود رہے ہیں اور شاگرد کا انتقال استاد کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا اور معاصرین کو تو ایک شخص کے متعلق الزامات کی تلاش رہتی ہے۔ پھر شریف رضی سے تو خود حکومتِ وقت کو بھی مخاصمت پیدا ہو چکی تھی۔ اس محضر پر دستخط نہ کرنے کی وجہ سے جو فاطمیینِ مصر کے خلاف حکومت نے مرتب کیا تھا اور جس پر علامہ رضی کے بڑے بھائی اور ان کے والدِ بزرگوار تک نے حکومت کے تشدد کی بنا پر دستخط کر دیے تھے، مگر علامہ سید رضی نے عواقب و نتائج سے بے نیاز ہو کر اس پر دستخط سے انکار کر دیا تھا علاوہ اس کے کہ اس کردار کا شخص جو صداقت کو ایسے قوی ترین محرکات کے خلاف محفوظ رکھے، اس طرح کی چھچھوری بات کر ہی نہیں سکتا کہ وہ ایک پوری کتاب خود لکھ کر امیرالمومنینؑ کی جانب منسوب کر دے جس کا غلط ہونا علمائے عصر سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا، اور اگر بالفرض وہ ایسا کرتے بھی تو ان کے دور میں ان کے کلام علمائے وقت اور ارکانِ حکومت کی طرف سے اس الزام کو شدت سے اچھالا جاتا اور سخت سے سخت نکتہ چینی کی جاتی، حالانکہ ہمارے سامنے خود ان کے عصر کے علماً کی کتابیں اور ان کے بعد کے کئی صدی تک کے مصنفین کے تحریرات موجود ہیں۔ ان میں سے کسی میں کمزور سے کمزور طریقے پر بھی ان کے حالاتِ زندگی میں اس قسم کے الزام کا عائد کیا جانا یا اس بارے میں ان پر کسی قسم کی نکتہ چینی کا ہونا موجود نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ صرف بربنائے جذبات نہج البلاغہ کے بعض مندرجات کو اپنے معتقدات کے خلاف پا کر کچھ متعصب افراد کی بعد کی

کارستانی ہے جو انھوں نے نہج البلاغہ کو کلامِ سید رضی قرار دینے کی کوشش کی ہے، ورنہ خود جناب سید رضی اعلی اللہ مقامہٗ کے دور میں اس کے مندرجات کا کلامِ امیرالمومنینؑ ہونا بلاتفریقِ فرقہ و مذہب ایک مسلم چیز تھی اور اسی لیے اس بارے میں کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکا۔

پانچواں امر یہ ہے کہ سید رضی اعلی اللہ مقامہٗ کے قبل ایسا نہیں ہے کہ امیر المومنینؑ کے خطبوں کا کوئی نام و نشان عالمِ اسلام میں نہ پایا جاتا ہوں، بلکہ کتبِ تاریخ و ادب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مسلم الثبوت ذخیرہ بحیثیتِ خطب امیرالمومنین علیہ السلام کے سید رضی رحمہ اللہ کے قبل سے موجود تھا۔ چنانچہ مورخ مسعودی نے جو علامہ سید رضی سے مقدم طبقے میں ہیں، بلکہ ان کی ولادت کے قبل وفات پا چکے تھے، اس لیے کہ علامہ سید رضی کا دورِ شباب ہی میں ۴۰۶ ہجری میں انتقال ہوا ہے اور مسعودی کی وفات ۳۴۰ ہجری میں ہوچکی تھی۔ جس وقت سید رضی کے استاد شیخ مفید ہی نہیں بلکہ ان کے بھی استاد شیخ صدوق محمد بن علی ابن بابویہ قمی بھی زندہ تھے، مسعودی نے اپنی تاریخ مروج الذہب میں لکھا ہے کہ

> والذی حفظ الناس عنه من خطبه فی سائر مقاماته اربعمائة خطبة و نیف و ثمانون خطبة یوردها علی البدیهة تداول الناس ذالک عنه قولاً و عملاً۔

(مروج الذہب، جلد ۲، ص ۳۳، طبع مصر)

> لوگوں نے آپ (حضرتِ علی ابنِ ابی طالبؑ) کے جو خطبے مختلف موقعوں کے محفوظ کرلیے ہیں، وہ چار سو اسی سے کچھ زیادہ تعداد میں ہیں جنھیں آپ نے فی البدیہہ ارشاد فرمایا تھا، جنھیں لوگوں نے نقلِ قول کے طور پر بھی بتواتر نقل کیا ہے اور اپنے خطب و مضامین میں ان کے اقتباسات وغیرہ سے بکثرت کام بھی لیتے رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ چار سو اسی سے کچھ اوپر خطبے اگر تمام و کمال یک جا کیے جائیں تو بلاشبہ نہج البلاغہ سے بڑی کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ جب یہ اتنا بڑا ذخیرہ سید رضی کی ولادت سے پہلے سے موجود تھا تو پھر علامہ سید رضی کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اس ذخیرے سے کام نہ لیں اور اپنی طرف سے نہج البلاغہ ایسی کتاب کو تحریر کردیں۔ ایسا اس شخص کے لیے کیا جاتا ہے جو گمنام ہو اور جس کا کارنامہ کوئی موجود نہ ہو اور اس کے اخلاف یا متتسبین خواہ مخواہ اس کو نمایاں بنانے کے لیے اس کی جانب سے کوئی کارنامہ تصنیف کردیں۔ صرف علامہ مسعودی کا یہ قول ہی اس ذخیرے کے ثبوت کے لیے کافی تھا، جبکہ اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ ذخیرہ آثارِ قدیمہ کے طور پر کسی دور و دراز عجائب خانے یا کسی ایک عالم کے متروکات میں شامل نہیں تھا جس تک رسائی کسی زحمت کی طلب گار ہوتی ہو، بلکہ حفظ الناس اور تداول الناس کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وہ عموماً اہل علم کے ہاتھوں میں موجود اور متداول تھا۔ اس کے علاوہ دورِ عباسیہ کے یگانۂ روزگار کاتب عبدالحمید بن یحیٰ، متوفی ۱۳۲ھ کا یہ مقولہ علامہ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں درج کیا ہے کہ

حفظت سبعین خطبة من خطب الاصلح ففاضت ثم فاضت۔

میں نے ستر خطبے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ازبر کیے ہیں جن کے فیوض و برکات میرے یہاں نمایاں ہیں۔

اس کے بعد ابن المقفع، متوفی ۱۴۲ھ کا اعتراف ہے جسے علامہ حسن الذوبی نے اپنے ان حواشی میں جو کتاب البیان و التبیین للجاحظ پر لکھے ہیں، وہ ابن مقفع کے بارے میں لکھتے ہیں:

الظاهر انه تخرج فی البلاغة علی خطب الامام علی

ولذلک کان یقول شربت من الخطب من ریا ولم اضبط
لھا رویا ففاضت ثم فاضت۔

غالباً ابن المقفع نے بلاغت میں امیرالمومنینؑ علیؑ ابن ابی طالب کے خطبوں سے استفادہ کیا تھا اور اسی بنا پر وہ کہتے تھے کہ میں نے خطبوں کے چشمے سے سیراب ہو کر پیا ہے اور اسے کسی ایک طریقے میں محدود نہیں رکھا ہے تو اس چشمے کے برکات بڑھے اور ہمیشہ بڑھتے رہے۔

اس کے بعد ابن نباتہ، متوفی ۳۷۴ھ یہ بھی سید رضی سے مقدم ہیں اور ان کا یہ قول ہے:

حفظت من الخطابة کنزا لا یزیده الانفاق الاسعة وکثرة
حفظت مائته فصل من مواعظ علی ابن ابی طالب۔

میں نے خطابت کا ایک خزانہ محفوظ کیا ہے جس سے جتنا زیادہ کام لیا جائے، پھر بھی اس میں برکت زیادہ ہی ہوتی رہے گی۔ میں نے سو فصلیں علی ابن ابی طالبؑ کے مواعظ میں سے یاد کی ہیں۔

ابن نباتہ کے اس قول کا بھی ابن ابی الحدید نے تذکرہ کیا ہے۔

رجال کشی میں ابو الصباح کنانی کے حالات میں لکھا ہے کہ زید ابن علی ابن الحسین جو زید شہید کے نام سے مشہور ہیں اور جن کی شہادت امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانۂ امامت میں ہوئی، وہ برابر امیرالمومنینؑ کے خطبوں کو سنا کرتے تھے۔

ابو الصباح کہتے ہیں: کان یسمع منی خطب امیر المومنین علیه السلام۔ یہ دوسری صدی ہجری کا ذکر ہے اور اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ ایک ذخیرہ خطبوں کا اس وقت بھی موجود تھا جو مسلم طور پر حضرتِ علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کی طرف نسبت رکھتا تھا۔

ان تمام مقامات پر بطورِ ارسال مسلمات خطب علی کہنا بتاتا ہے کہ اس زمانے میں اس بارے میں کوئی شک وشبہ بھی محسوس نہیں کیا جاتا تھا، ورنہ جیسا کئی صدی بعد جب کچھ اغراض کی بنا پر مصنفین نے اس حقیقت کو مشکوک بنانا ضروری سمجھا تو المنسوبۃ الی علی کہنے لگے۔ دورِ اول میں اس قسم کے شک وشبہ کے اظہار کرنے والی کوئی لفظ پائی نہیں جاتی۔

رجال کبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ زید ابن وہب جہنی متوفی حدود ۹۰ھ نے، جو خود حضرت امیرالمومنینؑ کے رواۃ احادیث میں سے ہیں، آپ کے خطبوں کو جمع کیا تھا اور اس کے بعد اور متعدد افراد ہیں جنھوں نے سید رضی کے پہلے حضرت کے خطب واقوال کو جمع کیا، جیسے:

(۱) ہشام ابن محمد ابن سائب کلبی، متوفی ۱۴۶ھ۔ ان کے جمع و تالیف کا ذکر فہرستِ ابن ندیم، جزو ۷، صفحہ ۲۵۱ میں موجود ہے۔

(۲) ابراہیم ابن ظہیر فرازی۔ ان کا ذکر فہرستِ طوسی میں یوں ہے:

صنف كتباً منها كتاب الملاحم و كتاب خطب علی علیه السلام۔

متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ منجملہ ان کے کتاب الملاحم اور کتاب خطب علی علیہ السلام ہے۔

اور رجال نجاشی میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔

(۳) ابو محمد مسعدہ ابن صدقہ عبدی۔ ان کے متعلق رجال نجاشی میں ہے:

له كتب منها كتاب خطب امير المومنين عليه السلام۔

ان کے متعدد تصنیفات ہیں جن میں سے ایک کتاب خطب علی علیہ السلام ہے۔

(۴) ابوالقاسم عبدالعظیم ابن عبداللہ حسنی جن کا مزار طہران سے تھوڑے

فاصلے پر شاہ عبدالعظیم کے نام سے مشہور ہے۔ یہ امام علی نقی علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ ان کے جمع کردہ خطبوں کا ذکر رجال نجاشی میں اس طرح ہے:

له کتاب خطب امیر المومنین علیه السلام۔

ان کی ایک کتاب خطب علی علیہ السلام ہے۔

(۵) ابوالخیر صالح ابن ابی حماد رازی۔ یہ بھی امام علی نقی علیہ السلام کے اصحاب میں سے ہیں۔ نجاشی میں ہے:

له کتب منها کتاب خطب امیر المومنین علی السلام۔

منجملہ آپ کی تالیفات کے کتاب خطب علی علیہ السلام ہے۔

(۶) علی ابن محمد ابن عبداللہ مدائنی، متوفی ۲۲۵ھ۔ انھوں نے حضرت کے خطبوں اور ان مکاتیب کو جمع کیا جو حضرت نے اپنے عمال کو تحریر فرمائے تھے۔ اس کا ذکر معجم الادبا یاقوت حموی، جزو ۵، صفحہ ۳۱۳ میں ہے۔

(۷) ابو محمد عبدالعزیز جلودی بصری، متوفی ۳۳۰ھ کے تصانیف میں کتاب خطب علی، کتاب رسائل، کتاب مواعظِ علیؑ، کتاب خطب علی علیہ السلام فی الملاحم کتاب دعائے علیؑ موجود ہیں جن کا تذکرہ شیخ طوسی نے فہرست میں اور نجاشیؒ نے ان کے طویل تصنیفات کے ذیل میں اپنے رجال میں کیا ہے۔

(۸) ابو محمد حسن ابن علی ابن شعبہؒ حلبی، متوفی ۳۲۰ھ نے اپنی مشہور کتاب تحف العقول (صفحہ ۱۳، طبع ایران) میں امیرالمومنینؑ کے کچھ کلماتِ امثال اور خطب کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

اننالو استغرقنا جمیع ما وصل الینا من خطبه و کلامه فی التوحید خاصة دون ما سواه من المعانی لکان مثل جمیع هذا الکتاب۔

اگر ہم وہ سب لکھنا چاہیں جو ہم نے حضرت کے خطبے اور آپ کا کلام
صرف توحید کے بارے میں پہنچا ہے علاوہ دوسرے موضوعات کے،
تو وہ پوری اس کتاب (تحف العقول) کے برابر ہوگا۔

اب مذکورۂ بالا تفصیل پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی میں زید ابن وہب جہنی نے حضرت کے خطبوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ دوسری صدی میں عبدالحمید ابن یحییٰ کاتب اور ابن مقفع کے دور میں وہ ذخیرہ مسلم طور پر موجود تھا اور اس صدی کے وسطی دور میں وہ خطبے پڑھے اور سنے جاتے تھے جیسا کہ زید شہید کے واقعے سے ظاہر ہوا، اور ادبا اس کو زبانی حفظ کرتے تھے جیسا کہ عبدالحمید اور ابن مقفع کے تصریحات سے ظاہر ہوا۔ اور تیسری صدی میں متعدد مصنفین نے جو جو خطبے ان تک پہنچے تھے، ان کو مدون کیا۔ ایسی صورت میں جناب سید رضی کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ وہ ان تمام ذخیروں کو نظرانداز کر کے یہ دماغی کاوش و کاہش گوارا کریں کہ وہ از خود کلام امیرالمومنینؑ کے نام سے کوئی چیز تصنیف کریں۔

چھٹا امر یہ ہے کہ ان تمام ذخیروں کے سابق سے موجود ہونے کے بعد ظاہر ہے کہ علامہ سید رضی کے لیے یہ تو قطعی ممکن نہیں تھا کہ وہ ان تمام ذخائر کو تلف کرا دیتے اور پھر اسی کی ترویج کرتے جو انھوں نے کلام امیرالمومنینؑ قرار دیا تھا۔ یہ قطعی ناممکن تھا۔ اگر وہ ذخیرہ کسی ایک مصنف کے پاس کسی ایک دور و دراز جگہ ہوتا، تو یہ امکان بھی تھا جیسا کہ مشہور ہے کہ شیخ ابو علی سینا نے فارابی کے تمام مصنفات کو کسی شخص سے حاصل کر کے انھیں تلف کر دیا اور ان چیزوں کو اپنی طرف منسوب کرلیا۔ یہاں یہ صورت قطعاً ناممکن تھی جبکہ وہ کلام ادبا کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اطراف و اقطارِ عالمِ اسلامی میں منتشر تھا اور بہت سے مصنفین اس کی تدوین کرچکے تھے، پھر جبکہ سید رضی کی تصنیف کے ساتھ ان ذخائر کا موجود ہونا لازمی تھا تو اگر سید رضی کا جمع کردہ کلام اس ذخیرے سے مختلف ہوتا یا اسلوبِ بیان

میں اس سے جدا ہوتا تو وہ تمام ادبائے زمانہ، خطبائے روزگار، علمائے وقت جو اس کلام کو دیکھتے ہوئے، پڑھے ہوئے یا یاد کیے ہوئے تھے، صدائے احتجاج بلند کر دیتے، ان میں تلاطم ہوجاتا اور سید رضی تمام دنیا میں اس کی وجہ سے بدنام ہوجاتے۔ کم از کم کوئی ان کے ہم عصر ادبا میں سے اس کی تنقید ہی کرتا ہوا ایک کتاب ہی اسی موضوع پر لکھ دیتا کہ امیرالمومنینؑ کا جو کلام اب تک محفوظ رہا، یہ سید رضی کے جمع کیے ہوئے ذخیرے سے مختلف ہے، خصوصاً جب وہ وجہ جو بعد میں ایک طبقے کو اس باب میں انکار یا تشکیک کی موجب ہوئی جس کی تفصیل کسی حد تک آئندہ درج ہوگی۔ وہ ایک مذہبی بنیاد تھی، یعنی یہ کہ نہج البلاغہ میں ان افراد کے بارے میں جنھیں سوادِ اعظم قابلِ احترام سمجھتا ہے، کچھ تعریضات یا انتقادی کلمات ہیں۔

ظاہر ہے کہ نہج البلاغہ سلطنتِ عباسیہ کے دارالسلطنت میں لکھی گئی جو اہلِ سنت کا علمی مرکز تھا۔ اس وقت بڑے بڑے علماؑ، حفاظ، ادبا، خطبا، اہلِ سیر اور محدثین اہلِ سنت میں موجود تھے اور ان کا جمِ غفیر خاص بغداد میں موجود تھا۔ اگر امیرالمومنینؑ کے وہ خطبات جو ابن المقفع، ابنِ نباتہ، عبدالحمید ابنِ یحیٰؒ، جاحظ اور دیگر مسلم الثبوت ادبا کے دور میں موجود تھے، ان تعریضات سے خالی تھے اور اس قسم کے مضامین ان میں نہ تھے، بلکہ فطری طور پر اس صورت میں اس کے خلاف چیزوں پر انھیں مشتمل ہونا چاہیے تھا تو اس وقت کے اہلِ سنت کے علماؑ اس پر قیامت برپا کر دیتے اور اس کو اپنے مذہب کے خلاف ایک عظیم حملہ تصور کر کے پورے طور سے اس کا مقابلہ کرتے اور اس کی دھجیاں اڑا دیتے، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا، کوئی دھیمی سی آواز بھی اس کے خلاف بلند نہیں ہوئی۔ یہ اس کا قطعی ثبوت ہے کہ سید رضی کے جمع کردہ مجموعے میں کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ وہ وہی تھا جو اس کے پہلے مضبوط و مدون، متداول و محفوظ رہا تھا، علماؑ قطعاً اس سے اجنبیت نہ رکھتے تھے بلکہ اس سے مانوس اور اس کے سننے کے اور یاد کرنے کے عادی تھے۔ وہ اس ادبی ذخیرے کو اس کی ادبی افادیت کے اعتبار سے سر آنکھوں پر رکھتے تھے اور اس

تنگ نظری میں مبتلا نہ تھے کہ چونکہ اس میں کچھ چیزیں ہمارے مذہب کے خلاف ہیں اس لیے اس کا انکار کیا جائے یا اس سے اجنبیت برتی جائے۔

ساتواں امر یہ ہے کہ بہت سی کتابیں علامہ سید رضی کے قبل کی اس وقت بھی ایسی موجود ہیں جن میں امیرالمومنینؑ کے اکثر مواقع کے کلام یا خطبات کو کسی مناسبت سے ذکر کیا ہے، جیسے جاحظ، متوفی ۲۵۵ھ کی البیان والتبیین، ابن قتیبہ دینوری، متوفی ۲۷۶ھ کی عیون الاخبار و غریب الحدیث، ابن واضح یعقوبی، متوفی ۲۷۸ھ کی مشہور تاریخ، ابو حنیفہ دینوری، متوفی ۲۸۰ھ کی اخبار الطوال، ابو العباس المبرد، متوفی ۲۸۶ھ کی کتاب المبرد مشہور مورخ ابن جریر طبری، متوفی ۳۱۰ھ کی تاریخ کبیر، ابن درید، متوفی ۳۲۱ھ کی کتاب المجتنیٰ، ابن عبدربہ، متوفی ۳۲۸ھ کی عقد الفرید، ثقۃ الاسلام کلینی، متوفی ۳۲۹ھ کی مشہور کتاب کافی، مسعودی متوفی ۳۴۶ھ کی تاریخ مروج الذہب، ابو الفرج اصفہانی، متوفی ۳۵۶ھ کی کتاب اغانی، ابو علی قالی، متوفی ۳۵۶ھ کی کتاب النوادر، شیخ صدوق، متوفی ۳۸۱ھ کی کتاب التوحید اور ان کے دوسرے جوامع حدیث، شیخ مفید رحمہ اللہ، متوفی ۴۱۶ھ اگرچہ تاریخ وفات کے اعتبار سے جناب رضی سے موخر ہیں، مگر ان کے استاد ہونے کی وجہ سے طبقتہً مقدم ہیں۔ ان کی کتاب الارشاد اور کتاب الجمل۔ ان تمام کتابوں میں جو حضرت کے خطبے درج ہیں، ان کا جب مقابلہ علامہ سید رضی کے مندرجہ خطب اور اجزائے کلام سے کیا جاتا ہے تو اکثر تو وہ بالکل متحد ہوتے ہیں۔ اور نہج البلاغہ میں ایسا درج شدہ کلام اگر کوئی ہے جو ان کتابوں میں درج نہیں ہے یا ان کتابوں میں کوئی کلام ایسا ہے جو نہج البلاغہ میں مذکور نہیں ہے تو اسلوبِ بیان اور اندازِ کلام، تسلسل و بلند آہنگی، جوش و حقائق نگاری کے لحاظ سے یقیناً متحد ہوتا ہے جس میں کسی واقفِ عربیت کو شک نہیں ہو سکتا۔ امیرالمومنینؑ کے اس کلام کا جو نہج البلاغہ میں درج ہے، اس تمام کلام سے جو حضرت کی طرف نسبت دے کر اور دوسری کتابوں میں درج ہے، متحد الاسلوب ہونا، پھر اس پہلو کے ضمیمے کے ساتھ

جس کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے کہ وہ خود سید رضی کے اس کلام سے جو نہج البلاغہ میں بطورِ مقدمہ یا بطورِ تبصرہ موجود ہے، بالکل مختلف ہونا ایک غیر جانب دار شخص کے لیے اس کا کافی ثبوت ہے کہ یہ واقعی امیرالمومنینؑ ہی کا کلام ہے جسے علامہ سید رضی نے صرف جمع کیا ہے۔

آٹھواں امر یہ ہے کہ خود علامہ سید رضی کے معاصرین یا ان سے قریب العہد متعدد لوگوں نے بطورِ خود بھی کلامِ امیرالمومنینؑ کے جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے اپنی کتابوں کے ضمن میں درج کیا ہے۔ جیسے ابنِ مسکویہ، متوفی ۴۲۱ھ نے تجارب الامم میں، حافظ ابو نعیم اصفہانی، متوفی ۴۳۰ھ نے حلیۃ الاولیا میں، شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی، متوفی ۴۶۰ھ نے جو شیخ مفید رحمہ اللہ سے تلمذ کی حیثیت سے علامہ رضی کے ہم طبقۃ اور علم الہدیٰ سید مرتضیٰ کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے اور نیز سالِ وفات کے اعتبار سے ان سے ذرا موخر ہیں، اپنی کتاب تہذیب اور کتاب الامالی میں؛ نیز عبدالواحد ابنِ محمد ابنِ عبدالواحد آمدی جو اسی عصر کے تھے، اپنی مستقل کتاب غرر الحکم و درر الکلم جو امیرالمومنینؑ کے مختصر کلمات پر مشتمل ہے اور مصر وصیدا اور ہندوستان میں طبع ہو چکی ہے اور اس کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے؛ نیز ابو سعید منصور ابنِ حسین آبی وزیر، متوفی ۴۲۲ھ اپنی کتاب نزہتہ الادب و نثر الدرو میں جس کا ذکر کشف الظنون، باب النون میں ہے اور قاضی ابو عبداللہ محمد بن سلامہ قطاعی شافعی، متوفی ۴۵۳ھ جن کی عظیم الشان کتاب اس موضوع پر دستور معالم الحکم کے نام سے ہے اور وہ مصر میں طبع ہو چکی ہے.... یہ سب تقریباً سید رضی کے معاصرین ہی ہیں۔ ان سب کی کاوشیں ہمارے سامنے موجود ہیں سوائے ابو سعید منصور کی کتاب کے جس کا کشف الظنون میں تذکرہ ہے۔ باقی یہ سب کتابیں مطبوع و متداول ہیں۔ ان میں جو کلام مندرج ہے، وہ بھی علامہ سید رضی کے درج کردہ کلام سے عیناً متحد یا اسلوب میں متفق ہی ہے۔ پھر اگر سید رضی کی نسبت یہ تصور کیا جائے کہ انھوں نے خود اس کلام کو تصنیف کر دیا ہے تو ان تمام

جامعین اور اپنی کتابوں کے ضمن میں درج کرنے والے دوسرے افراد کو کیا کہا جائے گا ؟ پھر ان کی نسبت بھی یہی تصور کرنا چاہیے ، جبکہ ان میں سے سب یا زیادہ افراد یقیناً جلالت شان اور ورع و تقویٰ وغیرہ میں علامہ سید رضی سے بالاتر نہیں معلوم ہوتے ۔ اب اگر ان سب کی نسبت یہی خیال کیا جائے تو خیر علامہ سید رضی تو اشعر الطالبین تھے اور کتبِ سیر انھیں خود ادبیت اور فصاحت و بلاغت میں معراج کمال پر ظاہر کرتے ہیں ، مگر ان میں سے ہر شخص کی نسبت تو یہ تصور قطعی غلط ہے کہ وہ سب علامہ سید رضی ہی کے ادبی حیثیت سے ہم پایہ تھے ، پھر ایسے مختلف المرتبہ اشخاص کی ذہنی کاوشوں اور قلمی ثمرات میں اتنا ہی فرق کیوں نہیں ہے جو خود ان اشخاص کے مبلغ علمی میں یقینی طور پر پایا جاتا ہے ۔ اشخاص کہ جو کلام کے جمع کرنے والے ہیں ، ان میں آپس میں زمین وآسمان کا فرق اور کلام جو انھوں نے جمع کیا ہے ، وہ سب ایک ہی مرتبے ، ایک ہی شان کا ۔ اسے دیکھتے ہوئے سوائے ایسے شخص کے جو جان بوجھ کر حقیقت کے انکار کرنے پر تلا ہوا ہو اور کسی کو اس میں شک وشبہ بھی باقی نہیں رہ سکتا کہ ان اشخاص کا کارنامہ صرف جمع و تالیف ہی ہے جس میں ان کے سلیقے اور ذوق کا اختلاف فقط شانِ ترتیب اور عنوانِ تالیف میں نمودار ہوتا ہے ، لیکن اصل کلام میں ان کی ذاتی قابلیت ، ذہانت اور مبلغِ علمی اور معیارِ ادبی کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہے ۔

نواں امر یہ ہے کہ مذکورۂ بالا افراد اگرچہ اپنے زمانۂ حیات کے کچھ حصوں میں علامہ سید رضی سے متحد ہیں ، مگر ان میں سے متعدد افراد کے سالِ وفات کو دیکھتے ہوئے یہ یقین ہے کہ ان کا زمانۂ جمع و تالیف نہج البلاغہ سے موخر ہے اور اس کے بعد ایک ایسا طبقہ ہے جو بالکل علامہ رضی سے موخر ہی ہے جیسے ابن ابی الحدید ، متوفی ۶۵۵ھ ؛ سبطِ ابن جوزی ، متوفی ۶۰۶ھ اور اس کے بعد بہت سے مصنفین ۔ ظاہر ہے کہ علامہ رضی کی کتاب نہج البلاغہ گوشۂ گمنامی میں اور ان لوگوں سے مخفی نہ تھی ۔ ان لوگوں کا محرک اس جمع و تالیف پر صرف یہ تھا کہ علامہ سید رضی نے

انتخاب سے کام لیتے ہوئے یا ماخذوں کی کمی سے یا ان نسخوں کے کرم خوردہ یا ناقص ہونے کی وجہ سے، جو ان کے پاس تھے، بہت سے اجزائے کلام امیر المومنینؑ کے نقل نہیں بھی کیے تھے، اس لیے مصنفین کو مستدرک اور مستدرک در مستدرک کی ضرورت پڑتی رہی جس کا سلسلہ ماضیِ قریب میں علامہ شیخ ہادی آل کاشف الغطا تک جاری رہا جنھوں نے مستدرک نہج البلاغہ تحریر فرمایا جو نجف اشرف میں طبع ہو چکا ہے اگر علامہ سید رضی کے قریب العہد یا ان کے بعد کے اہل قلم میں کسی کو بھی نہج البلاغہ کے مندرجہ کلمات و خطب میں یہ خیال ہوتا کہ یہ جناب سید رضی نے تصنیف کر کے اس میں شامل کر دیے ہیں تو وہ سب بالخصوص معاصرین جو کسی رعایت کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتے، اپنی کتابوں کی وجہِ تالیف میں اس کا تذکرہ ضرور سمجھتے کہ چونکہ اس کے قبل جو کتاب امیر المومنینؑ کے خطبوں پر مشتمل کہہ کر لکھی گئی ہے۔ اس میں آپ کا اصل کلام موجود نہیں ہے بلکہ وہ ساختہ و پرداختہ اور وضعی ہے، اس لیے ہمیں ضرورت محسوس ہوئی کہ ہم آپ کا اصلی کلام منظرِ عام پر لائیں، جبکہ ایسا نہیں ہوا اور یہ بالکل مشاہدہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ان سب کے نزدیک علامہ سید رضی نے جو کلام جمع کیا، وہ بلاشبہ کلامِ امیر المومنینؑ کی حیثیت سے اس کے پہلے سے مدون و متداول تھا اور ان کو سید رضی سے شکایت صرف بعض خطبوں کو چھوڑ دینے یا احاطہ و استقصا نہ کرنے یا شانِ ترتیب و عنوانِ تالیف میں کسی مناسب تر صورت کو اختیار نہ کرنے ہی کی تھی جس کے لیے انھوں نے بھی اس بارے میں کوشش ضروری سمجھی، جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور ممکن ہے کہ بعض مصنفین اب بھی کسی خاص ترتیب سے نہج البلاغہ کے مندرجہ خطب کو دیکھنے کے متمنی ہوں ۔ یہ دوسری چیز ہے اور اصل کلام کے بارے میں کسی شک و شبہ کا رکھنا دوسری چیز ہے۔

دسواں امر یہ ہے کہ تلاش کی جاتی ہے تو نہج البلاغہ کے مندرجہ خطب و اقوال کا پتہ اب بھی بعینہٖ الفاظہا نہج البلاغہ کے قبل تالیف شدہ کتابوں میں مل جاتا

ہے اور جبکہ اکثر حصہ اس کا قبل کی کتابوں میں مندرج موجود ہے تو تھوڑا سا حصہ اگر دستیاب نہ بھی ہو تو ایک معتدل ذہن میں اس سے کوئی شک وشبہ پیدا نہیں ہو سکتا، جبکہ یہ معلوم ہے کہ دنیا میں مختلف حوادث کے ذیل میں کتابوں کے اتنے ذخیرے تلف ہوئے ہیں جو اگر موجود ہوتے تو یقیناً موجودہ ذخائر سے بدرجہا زیادہ ہوتے۔ خود تاریخ نے کلام امیرالمومنینؑ کے جن جمع شدہ ذخیروں کا پتہ علامہ سید رضی کے قبل ہم تک پہنچا دیا ہے، وہی سب اس وقت کہاں موجود ہیں؟ اس لیے اگر بعض مندرجات رائج الوقت کتابوں میں نہیں بھی ملتے تو ذہن یہی فیصلہ کرتا ہے کہ ان کتابوں میں موجود ہوں گے جن تک ہماری اس وقت دسترس نہیں ہے۔ نہج البلاغہ کے مندرجات کے ان حوالوں کو پہلے علامہ شیخ ہادی کاشف الغطا نے مستدرک نہج البلاغہ کے اثنائے تالیف ہی میں مدارک نہج البلاغہ کے نام سے مرتب کیا تھا جو غالباً مکمل شائع نہیں ہوا ہے، اور ایک قابل قدر کوشش رام پور کے ایک سنی فاضل عرشی صاحب نے کی ہے جو فاران کراچی میں مقالے کی صورت میں شائع ہوئی ہے اور مزید تلاش کی جائے تو اس سلسلے میں مزید کامیابی کا بھی امکان ہے۔

گیارھوں امر یہ ہے کہ محققین علمائے شیعہ کا رویہ دیکھا جائے تو وہ ہر اس کتاب یا مجموعے کو جو معصومینؑ میں سے کسی کی طرف منسوب ہو، بلا چون وچرا صرف اس لیے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوجاتے کہ وہ معصومینؑ کی جانب منسوب ہے بلکہ وہ پوری فراخ حوصلگی کے ساتھ محققانہ فریضے کو انجام دیتے ہوئے اگر وہ قابلِ انکار ہوتا ہے تو کھل کر اس کا انکار کر دیتے ہیں اور اگر مشکوک ہوتا ہے تو شک وشبہ کا اظہار کر دیا کرتے ہیں۔ اس طرح بہت سے وہ ذخیرے جو کلامِ معصومین کے نام سے موجود ہیں، مقامِ اعتبار میں مختلف درجے اختیار کر چکے ہیں۔ مثلاً دیوانِ امیرالمومنینؑ بھی تو بطورِ کلامِ علیؑ ہی رائج ہے، مگر علمائے شیعہ بلا رو رعایت اسے غلط سمجھتے ہیں۔ اس سے بالاتر ذرا درجہ تفسیرِ امام حسن عسکریؑ کا ہے،

حالانکہ وہ شہرت میں تقریباً نہج البلاغہ سے کم نہیں ہے اور شیخ صدوق ایسے بلند مرتبہ قدیم محدث نے اس پر اعتماد کیا ہے، مگر اکثر علمائے شیعہ اسے تسلیم نہیں کرتے یہاں تک کہ ہماری قریبی دور کے محقق علامہ شیخ محمد جواد بلاغی نے ایک پورا رسالہ اس کے غلط ہونے کے اثبات میں لکھ دیا ہے۔ فقہ الرضا امام رضا علیہ السلام کی طرف منسوب ہے، مگر اس کے اعتبار اور عدمِ اعتبار کی بحث ایک مہتم بالشان علمی مسئلہ بن گئی ہے جس پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح جعفریات اور امام رضاعلیہ السلام کا رسالہ ذہبیہ وغیرہ کوئی نقد و بحث سے نہیں بچا ہے۔ اس رویے کے باوجود سید رضی کے بعد سے اس وقت تک کسی دور میں بھی کسی شیعہ عالم کا نہج البلاغہ کے خلاف آواز بلند نہ کرنا اور اس میں ذرہ بھر بھی شک و شبہ کا اظہار نہ کرنا اس کا ثبوتِ قطعی ہے کہ ان سب کی نظر میں اس کی حیثیت ان تمام مجموعوں سے ممتاز اور جداگانہ ہے۔ نہج البلاغہ کے ہم پلہ اس حیثیت سے اگر کوئی کتاب ہے تو وہ صرف صحیفۂ کاملہ جو اسی طرح مسلم طور پر امام زین العابدین علیہ السلام کے کلام کا مجموعہ ہے اور کوئی کتاب اس ذیل میں ان دونوں کے ہم مرتبہ نہیں ہے۔

مذکورۂ بالا وجوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ علامہ سید رضی کے بعد تقریباً دو، ڈھائی سو برس تک نہج البلاغہ کے خلاف کوئی آواز اٹھتے ہوئے معلوم نہیں ہوتی بلکہ متعدد علمائے اہلِ سنت نے اس کی شرحیں لکھیں؛ جیسے ابو الحسن علی ابنِ ابی القاسم بیہقی متوفی ۵۶۵ ھ، امام فخر الدین متوفی ۶۰۶ ھ، ابنِ ابی الحدید متوفی ۶۵۵ ھ، علامہ سعد الدین تفتازانی وغیرہ۔ غالباً انھیں علمائے اہلِ سنت کے شروح وغیرہ لکھنے کا یہ نتیجہ تھا کہ عوام میں نہج البلاغہ کا چرچا پھیلا اور اس کے ان مضامین کے بارے میں جو خلفائے ثلاثہ کے بارے میں ہیں، اہلِ سنت میں بے چینی پیدا ہوئی اور اب آپس میں بحثیں شروع ہو گئیں اور اس کی وجہ سے علماٗ کو اپنے اصول عقائد سنبھالنے کے لیے اور عوام کو تسلی دینے کے لیے نہج البلاغہ کے بارے میں شکوک و شبہات اور رفتہ رفتہ انکار کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ سب سے پہلے ابنِ خلکان، متوفی ۶۸۱ ھ نے

اس کو مشکوک بنانے کی کوشش کی اور علامہ سید مرتضیٰ کے حالات میں یہ لکھا:

قد اختلف الناس فی کتاب نهج البلاغة المجموعة من کلام علی ابن ابی طالب هل هو جمعه او اخوه الرضی و قد قیل انه لیس من کلام علی ابن ابی طالب و انما الذی جمعه و نسبه الیه هو الذی وضعه و اللّٰہ اعلم۔

لوگوں میں کتاب نہج البلاغہ کے بارے میں، جو امیرالمومنینؑ ابن ابی طالب کے کلام کا مجموعہ ہے، اختلاف ہے کہ وہ ان ہی (سید مرتضیٰ) کا جمع کردہ ہے یا ان کے بھائی سید رضی کا اور بعض کہتے ہیں کہ یہ جنابِ امیر کا کلام ہی نہیں ہے، بلکہ جسے جامع سمجھا جاتا ہے، اسی کی یہ تصنیف ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ امر بہت قابلِ لحاظ ہے کہ نہج البلاغہ کے بارے میں اختلافی آواز ڈھائی صدی کے بعد بھی نہج البلاغہ کے تالیف کے مرکز، یعنی بغداد یا ملکِ عراق کے کسی شہر سے بلند نہیں ہوئی، بلکہ مغربی مملکت جہاں بنی امیہ کی سلطنت تھی اور قیروان و قرطبہ میں جس سلطنت کے زیرِ اثر علماً کی پرورش ہو رہی تھی، وہاں ابن خلکان مغربی کی زبان سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ جنھیں اختلف الناس کہا جا رہا ہے، یہ مسلمان دارالخلافے کے کوئی ذمے دار افراد نہیں ہیں، ورنہ اختلف العلماء، اختلف المحققون، اختلف الادباء ایسے کوئی وقیع الفاظ درج کیے جاتے، بلکہ یہ الناس اموی سلطنت کے پروردہ مملکتِ مغربیہ کے سنی عوام ہیں جنھیں یہ خبر تک نہیں ہے کہ یہ کتاب سید رضی کی جمع کردہ ہے یا سید مرتضیٰ کی، اور یہ جناب ابنِ خلکان کا تقیہ ہے کہ وہ خود اپنے اطلاعات کو، جو اس کتاب اور اس کے جامع کے بارے میں یقیناً ان کو تھے، پیش نہیں کرتے بلکہ عوام کے جذبات کی تسلی کے لیے خود انھیں عوام کے اختلافات کی ترجمانی کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ

بعض لوگ اسے سید مرتضیٰ کا جمع کردہ کہتے ہیں اور بعض سید رضی کا اور خود ان کے ضمیر کا فیصلہ پہلے آجاتا ہے کہ جمع کرنے والا کوئی بھی ہو لیکن ہے وہ کلام امیرالمومنینؑ ہی کا ۔ اور پھر عوامی جذبات کو دھچکا پہنچنے کے اندیشے سے وہ بعض ان متعصب مجہول الاسم والرسم اشخاص کے اس عذر کو جو اس مضامین کے تسلیم کرنے سے گریز کے لیے وہ مقام مناظرہ میں پیش کرتے تھے کہ ہم اسے کلامِ علیؑ ہی تسلیم نہیں کرتے ۔ وہ قیل کہہ کے ذکر کردیتے ہیں کہ بعض ایسا کہتے ہیں کہ یہ امیرالمومنینؑ کا کلام ہے ہی نہیں بلکہ جس نے جمع کیا ہے، اسی نے اس کو تصنیف کر دیا ہے ۔ یہ خود قیل اس قول کے ضعف کے لیے کافی تھا، لیکن خود ان کا ضمیر اس قیل سے چونکہ مطمئن نہیں ہے لہذا آخر میں واللہ اعلم کہہ کے وہ اس میں مزید شک و شبہ کا اظہار کردینا چاہتے ہیں ۔ اس سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ ابن خلکان اس بارے میں اپنے فیصلے کو ماحول کے دباؤ سے ظاہر کرنا نہیں چاہتے اور وہ صرف عوام کی باہمی چہ میگوئیوں کا تذکرہ کر کے اپنا دامن بچا لے جانا چاہتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تشکیک کا علمی دنیا میں کوئی وزن ہی نہیں مانا جاسکتا ۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے ۔ اگرچہ علامہ ابن خلکان نے اپنے ضمیر کی تحریک سے بہت حد تک اپنے کو نہج البلاغہ کے انکار کی ذمے داری سے بچایا تھا، مگر ان کے ان الفاظ نے بعد والے میدان مناظرہ کے پہلوانوں کو آسانی سے یہ داؤ بتا دیا کہ وہ نہج البلاغہ کے کلامِ امیرالمومنینؑ ہونے کا انکار کردیں ۔ چنانچہ اس کے ایک صدی کے بعد ذہبی نے جو اپنے دور کے انتہائی متعصب شخص تھے، یہ جرأت کی کہ وہ اس شک کو یقین کا درجہ دے دیں اور انھوں نے سید مرتضیٰ کے حالات میں لکھ دیا کہ:

من طالع کتابه نهج البلاغة جزم بانه مکذوب علی امیر المومنین ففیه السب الصریح بل حط علی السیدین ابی بکر و عمر ۔

جو شخص ان کی کتاب نہج البلاغہ کو دیکھے ، وہ یقین کر سکتا ہے کہ
امیر المومنین حضرتِ علیؑ کی طرف اس کی نسبت بالکل جھوٹ ہے ،
اس لیے کہ اس میں کھلا ہوا سب و شتم اور ہمارے دونوں سرداروں
ابو بکر اور عمر کی تنقیص ہے ۔

اب آپ ذرا اس عجیب رفتار کو دیکھیے کہ تالیفِ نہج البلاغہ سے دو، ڈھائی سو برس بعد ، یعنی ابن خلکان کے عہد تک تو اختلاف یا شک و شبہ کا بھی نہج البلاغہ کے بارے میں پتہ نہیں چلتا ۔ اس کے بعد ابن خلکان ملکِ مغرب میں بیٹھ کر عوام الناس کے اختلاف کا اس بارے میں اظہار کرتے ہیں کہ یہ سید مرتضیٰ کی جمع کردہ کتاب ہے یا سید رضی کی اور ایک ضعیف قول اس کا بیان کرتے ہیں کہ اس کی نسبت امیر المومنینؑ کی جانب غلط ہے اور پھر واللہ اعلم کہہ کر اس تغلیط کو مشکوک کرتے ہیں ۔ یہ اس وقت جبکہ قربِ عہد کی وجہ سے پھر بھی ذرائع اطلاع زیادہ ہو سکتے تھے اور اس کے ایک صدی کے بعد ذہبی پہلے تو بیک گردشِ قلم اس اختلاف کو ، جو جامع کے بارے میں تھا ، ختم کر کے اسے سید مرتضیٰ کا کارنامہ قرار دے دیتے ہیں اور پھر اس شک کو یقین کا درجہ دے کر یہ کہتے ہیں کہ جو بھی نہج البلاغہ کا مطالعہ کرے وہ ایسا ہی یقین کرے گا ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے وقت تک تین سو برس میں گویا کسی نے اس کتاب کا مطالعہ ہی نہ کیا تھا یا انھیں کوئی ایسی عینک ملی ہے جو اس کے پہلے کسی کے پاس نہ تھی اور اب وہ اسی عینک سے اپنے دور کے بعد ہر شخص کو نہج البلاغہ کے مطالعے کی دعوت دے رہے ہیں ۔ وہ عینک کیا ہے ، اسے خود اپنے آخرِ کلام میں درج کر دیتے ہیں ۔ علمی حیثیت سے اصولِ روایت کے لحاظ سے تنقیدی قوانین کے پیشِ نظر انھیں چاہیے تھا کہ اس کی نسبت غلط ہونے کے ثبوت میں امیر المومنینؑ کا وہ مسلم کلام پیش کرتے جو سید رضی کے علاوہ دوسرے مستند ماخذوں سے ان کے نزدیک مسلم ہوتا اور وہ سید رضی کے مندرجہ مضامین سے مختلف ہوتا ، خود سید رضی کے زمانے والے مصنفین کے انتقادات کا حوالے دیتے کہ

انھوں نے بھی اسے غلط قرار دیا ہے۔ اس تین سو برس کی مدت میں دوسرے علماؑ و ناقدین نے جو کچھ اس کی رد و قدح کی ہوتی، اسے پیش کرتے، مگر ان کے جیب و دامنِ تحقیق میں کوئی ایسی سند موجود نہیں ہے۔ ان کی دلیل اس نسبت کے یقینی طور پر جھوٹ ہونے کی صرف یہ ہے کہ اس میں ان کے دو سرداروں کی تنقیص ہے۔ کیا علمی دنیا میں اس دلیل کی کوئی قیمت ہو سکتی ہے؟ یہ بالکل ایسا ہے جیسے قرآن نازل ہونے کے چند صدی بعد کوئی طبقہ مشرکین کا قرآن کے کلامِ الہیٰ ہونے سے صرف اس لیے انکار کرے کہ اس میں ان کے الٰہہ کے خلاف تنقیص و مذمت کی آیتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حقیقت کو اپنے جذبات کا تابع بنا کر اگر جانچا جائے تو کوئی حقیقت باقی ہی نہیں رہ سکتی۔ لو اتبع الحق اھوائھم لفسدت السمٰوٰت والارض۔ اس دروازے کے کھل جانے کے بعد تمام اصولِ روایت و درایت معطل و بے کار ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ ہر عقیدے اور خیال کا انسان پھر ہر قوی سے قوی نص کو صرف اس بنا پر رد کر دے گا کہ وہ اس کے عقیدے اور خیال کے خلاف ہے۔ جہاں تک خلفائے ثلاثہ کے مقابل میں شیعوں کے استدلال کا تعلق ہے وہ احادیثِ رسولؐ یہاں تک کہ صحاحِ ستہ میں درج شدہ اخبار و احادیث سے بھی اس میں تمسک کرتے ہیں اور نہج البلاغہ کے مندرجات سے کچھ کم وہ احادیثِ پیغمبرؐ سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ محتاط اور علمی اصول کے کسی حد تک پابند علمائے اہلِ سنت کا یہ طریقہ رہا کہ وہ ان احادیث کے مضامین و مطالب کے تاویلوں سے ہمیشہ کام لیتے رہے اور بالکل ان احادیث کے انکار کی جرأت نہیں کی۔ مناظرانہ ضرورتوں سے انکار نصوص کا یہ رجحان جس کا مظاہرہ ذہبی نے کیا ہے، یہ بڑھتے بڑھتے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے زمانے میں یہاں تک آیا کہ شروع شروع عیسائی مبلغین سے مناظرے میں انھیں وفاتِ مسیحؑ کے خیال کو پیش کرنے کی ضرورت ہوئی۔ صرف اس جذبے کے ماتحت کہ جنابِ عیسیٰؑ کی یہ ایک طرح کی فضیلت عیسائی پیش کرتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں، لہذا اس کو ختم کرنا چاہیے۔ انھوں نے اس مناظرانہ

ترکیب کو اصل قرار دیا اور پھر جو اسلامی نصوص اور متفق علیہ احادیث اس بارے میں تھے، ان سب کا انکار کر دیا اور آخر میں خود ان کے دعوائے مسیحیت کے لیے ایک راستہ بن گیا۔یہی جذبہ ترقی کر کے اب اہل قرآن کے ہاتھوں، جن کی نمائندگی طلوع اسلام وغیرہ کر رہے ہیں، یہاں تک پہنچا ہے کہ وہ یہ دیکھتے ہوئے کہ طبری اور دوسرے مفسرین اور مورخین سب کے یہاں کچھ نہ کچھ شیعوں کے موافق باتیں موجود ہیں، اس لیے کلیتہً احادیث، تفاسیر اور تواریخ کے اعتبار پر انھوں نے ضرب لگا دی ہے اور ان سب کے انکار کی یہی بنیاد ہے کہ ان لوگوں نے شیعوں کے موافق چیزیں درج کی ہیں، لہذا یہ سب جھوٹ ہے۔ جو عمارت ایک غلط اساس پر قائم کی جاتی ہے، اس کا آخری انجام یہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ حقیقت کو صرف حقیقت کے اعتبار سے دیکھتے اور پھر اپنے جذبات کو اس کے ماتحت لانے کی کوشش کرتے جو ایک عام مسلمان کا فریضۂ ایمانی ہے، چہ جائیکہ وہ افراد جو اپنے کو علمائے اسلام قرار دیتے ہوں یا دنیا میں اس حیثیت سے متعارف ہوں۔

اس کے بعد کی صدیوں میں یہ دروازہ پاٹوں پاٹ کھل ہی گیا تھا، چنانچہ اب تو مناظرے کے میدان کا یہ بہت ہی عام ہتھیار بن گیا کہ جب نہج البلاغہ کا کوئی کلام پیش ہو تو اسے غلط کہہ دیا جائے۔ اس کے بعد پھر موجودہ دور میں تو اور بھی بہت سے جذبات کارفرما ہو گئے ہیں۔ مثلاً تجدد پسند طبقے کا یہ رجحان کہ عورت ہر بات میں مرد کے برابر ہے، جب نہج البلاغہ کے مندرجات سے مجروح ہوتا ہے تو اس جذبے کے تحفظ کے لیے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ حضرتِ علیؑ کا کلام نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں عورتوں کی تنقیص ہے، اور موجودہ سائنس سے اس کے نظریات کو ٹکراتے ہوئے دیکھا جاتا ہے تو سائنس کو اصل قرار دے کر اس کا انکار کر دیا جاتا ہے کہ یہ حضرتِ علیؑ کا کلام ہو۔ کبھی اس جذبے کے ماتحت کہ اس میں ان علوم و فنون کی حقیقتوں کا اظہار ہے جسے بعد والے اپنے وقت کا کارنامہ سمجھتے ہیں، یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کلام بعد کی پیداوار ہے، اس لیے کہ اس وقت عرب میں یہ علوم و

فنون تھے ہی نہیں، یہاں تک کہ کسی ایک لفظ مثلاً سلطان بمعنی بادشاہ کو حادث قرار دے کر اس لفظ کے استعمال کو نہج البلاغہ میں اس کی دلیل بنایا جاتا ہے کہ یہ جنابِ امیر کی زبان سے نہیں نکل سکتا، حالانکہ یہ سب باتیں صرف اپنی خواہشوں کی تکمیل کا ایک بہانہ ہیں اور اپنے مزعومات کو اصل قرار دے کر حقیقتوں کو ان کا تابع بنا لینے کا کرشمہ ہے۔ قرآن مجید میں درج شدہ حقائق کب ایسے ہیں جو اس وقت کے عربوں کو معلوم ہوں اور احادیثِ رسولؐ کے بہت سے معارف کب اس وقت کی دنیا کو معلوم تھے جو بابِ مدینۃ العلم کے اقوال میں کچھ ایسے علوم و فنون کے انکشاف پر تعجب کیا جائے جن کو اس وقت کی دنیا کو خبر نہ تھی۔ ہر لفظ جس کے لیے کسی قدیم عربی شعر کو سند میں پیش کیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس شعر سے پہلے اس کے ماخذ کا ہمیں علم نہیں ہوتا، ورنہ اس شعر کو ہم سند ہی قرار دینے کی کیوں زحمت محسوس کرتے۔ تو کیا اس تصور کو حقیقت قرار دے کر کہ اس کے پہلے یہ لفظ کہیں نہیں ہے، ہم اس شعر کو انکار کردیں گے یا صحیح طریقہ یہ ہوگا اور یہی اصول معمول بہ ہے کہ اس شعر میں اس لفظ کے وجود سے خود ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس لفظ کا زبانِ عرب میں رواج تھا۔ اسی طرح ہم آخر لفظ سلطان میں یہ اصول کیوں اختیار کرتے ہیں کہ ہم اپنے اس مزعومہ کو وحی منزل قرار دیں کہ یہ لفظ حادث ہے اور کلامِ عرب میں موجود نہ تھی۔ خود جناب امیر علیہ السلام کے کلام میں اس کا وارد ہونا اس کا ثبوت کیوں نہ ہو کہ یہ لفظ چاہے عام اکثریت کی زبان پر جاری نہ ہو، لیکن وہ کلیتہً مفقود نہیں تھی اور اس کا شاہد یہی کلامِ امیرالمومنینؑ کیوں قرار نہ پائے۔ پھر السلطان کو لفظی طور پر بمعنی ملک قرار دینے کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ وہ بمعنی مصدری یعنی حکومت و اقتدار اور غلبہ یقینی موجود تھا اور قرآن مجید میں بھی اس کے نظائر موجود ہیں۔ ذریعۂ غلبہ ہونے ہی کی بنا پر دلیل کو سلطان کہا گیا ہے جس طرح اسی اعتبار سے اس کو حجت کہا جاتا ہے اور یہی معنی مصدری بعد میں اسمی شکل اختیار کر کے بمعنی ملک ہوگئے ہیں، تو اس میں کیا دشواری ہے کہ اذا تغیر السلطان

تغیر الزمان میں ہم السلطان کو حاکم کے معنی میں نہیں بلکہ حکومت و اقتدار کے معنی میں لیں جو ہماری زبان میں بھی بمعنی حاکم برابر رائج ہے۔ لفظی طور پر یہ معنی نہ کہیں کہ جب بادشاہ بدلتا ہے تو زمانہ بدل جاتا ہے، بلکہ یہ معنی کہیں کہ جب اقتدار بدلتا ہے تو زمانے میں بھی تغیر ہوجاتا ہے۔ نتیجہ وہی ایک ہے، مگر وہ ہمارا مزعومہ بھی اگر ہمیں بہت عزیز ہو تو اس صورت میں محفوظ رہتا ہے۔ غرض یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں جو کسی اصول روایت و درایت پر منطبق نہیں ہوتیں۔ خلفا کے بارے میں نہج البلاغہ میں ہرگز کوئی ایسی سخت بات نہیں ہے جو دوسری کتابوں میں موجود نہ ہو اور جنابِ امیر علیہ السلام کے ان رجحانات کے مطابق نہ ہو جو مسلم الثبوت حیثیت سے دوسرے کتبِ اہل سنت میں بھی موجود ہیں۔ ایسی صورت میں اس قسم کے الفاظ کا حضرت کی زبان پر آنا تو اس کا ثبوت ہے کہ وہ آپ کا کلام ہے۔ ہاں! اگر آپ کے واقعی رجحانات کے خلاف اس میں الفاظ ملتے تو اس پر تو غور کرنے کی بھی ضرورت ہوتی کہ وہ کس بنا پر ہیں یا انھیں کسی مجبوری کا نتیجہ قرار دینا پڑتا جیسے بعض علماً کے خیال مطابق للہ بلا فلان والا خطبہ یہی نوعیت رکھتا ہے۔ مگر وہ کلام جو اپنے متکلم کے خیالات کا نمایاں طور پر آئینہ بردار ہو، اسے تو کسی حیثیت سے اس متکلم کی طرف نسبت صحیح ماننے میں تامل کا کوئی سبب ہی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ باوجود ابن خلکان کے اس اظہارِ تذبذب اور ذہبی کے اس جسارتِ انکار کے پھر بھی منصف مزاج اور حقیقت پسند علماؑ و محققین بلا تفریق مذہب و ملت نہج البلاغہ کے مندرجات کو کلامِ امیر المومنینؑ مانتے رہے اور اس کا اظہار کرتے رہے جن میں سے کچھ افراد کا جو سرِدست پیش نظر ہیں، ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) علامہ شیخ کمال الدین محمد ابن طلحٰہ قریشی شافعی، متوفی ۶۵۲ھ اپنی کتاب مطالب السوَل فی مناقبِ آل الرسول میں، جو لکھنؤ میں بھی طبع ہو چکی ہے، علومِ امیر المومنینؑ کے بیان میں لکھتے ہیں:

و رابعها علم البلاغة و الفصاحة و كان فيها اماما لا يشق غباره و مقدما لا تلحق اثاره و من وقف على كلامه المرقوم الموسوم بنهج البلاغة صار الخبر عنده عن فصاحته عيانا و الظن بعلو مقامه فيه ايقانا۔

چوتھے علمِ فصاحت و بلاغت، آپ اس میں امام کا درجہ رکھتے تھے جن کے گردِ قدم تک بھی پہنچنا ناممکن ہے، اور ایسے پیشرو تھے جن کے نشانِ قدم کا مقابلہ نہیں ہو سکتا، اور جو حضرت کے اس کلام پر مطلع ہو جو نہج البلاغہ کے نام سے موجود ہے، اس کے لیے آپ کی فصاحت کی سماعی خبر مشاہدہ بن جاتی ہے اور آپ کی بلندیِ مرتبہ کا اس باب میں گمان یقین کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

النوع الخامس فی الخطب والمواعظ ممانقلته الرواة وروته الثقات عنه عليه السلام قد اشتمل كتاب نهج البلاغة المنسوب اليه على انواع من خطبه و مواعظه الصادعة باو امرها و نواهيها المطلعة انوار الفصاحة و البلاغة مشرقة من الفاظها و معانيها الجامعة حكم عيون علم المعانى و البيان على اختلاف اساليها۔

پانچویں قسم ان خطب اور مواعظ کی شکل میں ہے جس کو راویوں نے بیان کیا ہے اور ثقات نے حضرت سے ان کو نقل کیا ہے، اور

نہج البلاغہ کتاب جس کی نسبت حضرت کی طرف دی جاتی ہے ، وہ آپ کے مختلف قسم کے خطبوں اور موعظوں پر مشتمل ہے جو اپنے اوامر و نواہی کو مکمل طور پر ظاہر کرتے اور فصاحت و بلاغت کے انوار کو اپنے الفاظ و معانی سے تابندہ شکل میں نمودار کرتے اور فن معانی و بیان کے اصول اور اسرار کو اپنے مختلف اندازِ بیان میں ہمہ گیر صورت سے ظاہر کرتے ہیں۔

اس میں مندرجاتِ نہج البلاغہ کو معتبر و ثقہ راویوں کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے یقینی طور پر کلام امیرالمومنینؑ تسلیم کیا ہے۔ایک جگہ جو منسوب کی لفظ ہے ، اس سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے ، وہ بحیثیتِ مجموعی کتاب بشکلِ کتاب سے متعلق ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ کتاب امیرالمومنینؑ کی جمع کردہ نہیں ہے ۔ کتاب تو حقیقتہً سید رضی ہی کی ہے ، مگر عوام مجازی طور پر یا ناواقفیت کی بنا پر یونہی کہتے ہیں یہ امیرالمومنینؑ کی کتاب ہے ۔ یہ نسبت اس کلام کے لحاظ سے دی جاتی ہے جو اس کتاب میں درج ہے اور اسی لیے اس محل پر علامہ ابن طلحہؒ نے منسوب کی لفظ صرف کی ہے جو بالکل درست ہے ، اس سے اصل کلام کے بارے میں ان کے وثوق و اطمینان کو کوئی دھچکا نہیں پہنچتا۔

(۲) علامہ ابو حامد عبدالحمید ابن ہبۃ اللہ المعروف بابن ابی الحدید مدائنی بغدادی ، متوفی ۶۵۵ ھ جنھوں نے اس کتاب کی مبسوط شرح لکھی ہے ، وہ حضرتِ امیر علیہ السلام کے فضائلِ ذاتیہ میں فصاحت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

اما الفصاحة فهو امام الفصحاء و سيد البلغاء و عن كلامه قبل دون كلام الخالق و فوق كلام المخلوقين و منه تعلم الناس الخطابة و الكتابة۔

فصاحت کی آپ کا یہ عالم ہے کہ آپ فصحا کے امام اور اہلِ بلاغت کے سرگروہ ہیں ۔آپ ہی کے کلام کے متعلق یہ مقولہ ہے کہ وہ

خالق کے کلام کے نیچے اور تمام مخلوق کے کلام سے بالاتر ہے اور آپ ہی سے دنیا نے خطابت و بلاغت کے فن کو سیکھا۔

اس کے بعد عبدالحمید بن یحییٰ اور ابن نباتہ کے وہ اقوال درج کیے گئے ہیں جن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں، پھر لکھا ہے:

و لما قال محقن ابن ابی محقن لمعاویۃ جئتک من عند اعبی الناس قال لہ و یحک کیف یکون اعبی الناس فو اللّٰہ ما سن الفصاحۃ لقریش غیرہ و یکفی ھذا الکتاب الذی نحن شارحوہ دلالۃ علی انہ لا یجاری فی الفصاحۃ و لا یباری فی البلاغۃ۔

اور جب محقن بن ابی محقن نے (خوشامد میں) معاویہ سے کہا کہ میں سب سے زیادہ گنگ شخص کے پاس سے آیا ہوں، معاویہ نے کہا کہ وائے ہو تم پر، وہ گنگ کیونکر کہے جاسکتے ہیں، حالانکہ خدا کی قسم فصاحت کا راستہ قریش کو سوا ان کے کسی اور نے نہیں دکھایا ہے اور یہی کتاب، جس کی ہم شرح لکھ رہے ہیں، اس امر کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ حضرت فصاحت میں وہ بلند درجہ رکھتے ہیں کہ کوئی آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا اور بلاغت میں آپ کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

علامۂ مذکور دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

ان کثیرا من فصولہ داخل فی باب المعجزات المحمدیۃ لاشتمالھا علی الاخبار الغیبیۃ و خروجھا من وسع الطبیعۃ البشریۃ۔

اس کتاب کے اکثر مقامات حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ کہے جاسکتے ہیں، اس لیے کہ وہ غیبی خبروں پر مشتمل

ہیں اور انسانی طاقت کے حدود سے باہر ہیں ۔

حالانکہ علامہ ابن ابی الحدید اپنے معتقدات میں ، جو شیعیت کے خلاف ہیں ، پورے راسخ ہیں اور اس لیے نہج البلاغہ میں جہاں جہاں ان کے معتقدات کے خلاف چیزیں ہیں ، ان کو کافی زحمت درپیش ہوئی ہے ، مگر اس کے باوجود کسی ایک مقام پر بھی وہ اس شک و شبہ کا اظہار نہیں کرتے کہ یہ شاید امیر المومنینؑ کا کلام نہ ہو ، بلکہ خطبہ شقشقیہ تک میں ، جو سب سے زیادہ ان کے جذبات کے خلاف مضامین پر مشتمل ہے ، وہ اس امر کو بقوت تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ہے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا کلام ضرور اور اس کے خلاف ہر تصور کو دلائل کے ساتھ رد کر دیتے ہیں ۔ انھوں نے خطبے ہی میں قدم المفضول علی الفاضل خدا نے (معاذ اللہ!) کسی مصلحت سے غیر افضل کو افضل پر مقدم کر دیا اور اسی طرح خطبۂ شقشقیہ وغیرہ کے تشریحات میں انھوں نے اپنے معتقدات کا اظہار کر دیا ہے اور امیر المومنینؑ کے الفاظ کو ، معاذ اللہ! آپ کے بشری جذبات کا تقاضا قرار دیا ہے ۔ یہ امور اس تصور کو ختم کر دیتے ہیں کہ انھوں نے اس کتاب میں اس شیعہ رئیس کی خوشامد مدِ نظر رکھی ہے جس کے نام پر انھوں نے یہ شرح معنون کی تھی ۔ ابن العلقمی شیعہ ضرور تھے ، مگر وہ سلطنتِ بنی عباس کے وزیر تھے اور یہ کتاب دولتِ عباسیہ کے سقوط سے پہلے ان کے دورِ وزارت میں لکھی گئی ہے ۔ اول تو اگر خوشامد مدِ نظر ہوتی تو وزیر کے بجائے خود خلیفۂ وقت کے جذبات کا لحاظ کرنا زیادہ ضروری ہوتا ۔ دوسرے ظاہر ہے کہ سلطنتِ عباسیہ کے وزیر ہونے کی بنا پر خود ابن العلقمی بھی کھل کر ایسے شخص کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکتے تھے جو حکومتِ وقت کے مذہب کے موافق کوئی بات کہے نہ وہ خود ہی ایسے جذبات کا علانیہ اظہار کرتے تھے ۔ پھر اگر ان کی خوشامد ہی پیشِ نظر ہوتی تو ابن ابی الحدید اسی کتاب میں شیعیت کی رد کیوں کرتے اور خلافتِ ثلاثہ کو شروع سے لے کر آخر تک بقدرِ امکان مضبوط کرنے کی کوشش کس لیے کرتے ؟ ان کا یہ طرزِ عمل صاف بتا رہا ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں اپنے حقیقی خیالات اور جذبات کو برابر

پیشِ نظر رکھا ہے ۔ وہ اگر نہج البلاغہ کی صحت میں ذرا سا شک و شبہ کا بھی اظہار کر دیتے تو وہ اس سے زیادہ ابنِ العلقمی کے لیے تکلیف دہ نہیں ہو سکتا تھا جتنا خدا کی طرف اس غلط کام کو منسوب کرنا کہ وہ مفضول کو فاضل پر ترجیح دے دیتا ہے یا امیرالمومنینؑ کے اقوال کو، معاذاللہ! نفسانیت پر محمول کرنا جو خطبۂ شقشقیہ وغیرہ کی شرح میں انھوں نے لکھ ڈالا ہے، بلکہ ایک شیعہ کے لیے ان الفاظ کے کلامِ امیرالمومنینؑ ہونے سے انکار کر دینا اتنا صدمہ نہیں پہنچا سکتا اور حضرتِ علیؑ ابنِ ابی طالب کی اتنی بڑی توہین نہیں ہے جتنا یہ تصور کرنا کہ حضرت نے، معاذاللہ! حقیقت کے خلاف صرف اپنی ذاتی رنجش کی بنا پر یہ الفاظ فرما دیے ہیں ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہرگز ابنِ ابی الحدید کو ابنِ العلقمی کی کوئی خاطرداری اظہارِ خیالات میں پیشِ نظر نہ تھی اور کتاب پر ابنِ العلقمی نے اگر کوئی انعام دیا ہو تو یہ صرف ان کے وسعتِ صدر اور وسعتِ نظر اور تحمل کا ثبوت ہے کہ انھوں نے ایک مخالفِ مذہب کے ایک علمی کارنامے کی صرف علمی کارنامہ ہونے کی بنا پر قدر کی جو ان کے خود عقائد و خیالات سے متضاد مضامین پر بھی مشتمل تھا ۔ میرے خیال میں تو ابنِ ابی الحدید نے اپنی سنّیّت کو اس کتاب میں اتنا ضرورت سے زیادہ طشت از بام کیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی رو رعایت کا تصور بھی پیدا ہونا غلط ہے ۔

(۳) ابوالسعادات مبارک مجد الدین ابنِ اثیر جزری ، متوفی ۶۰۶ھ نے اپنی مشہور کتاب نہایہ میں، جو احادیث و آثار کے لغات کی شرح کے موضوع پر ہے، کثیرالتعداد مقامات پر نہج البلاغہ کے الفاظ کو حل کیا ہے ۔ ابنِ اثیر کی حیثیت فقط ایک عام لغوی کی نہیں ہے بلکہ وہ محدث بھی ہیں ۔ اگر صرف ادبی اہمیت کے لحاظ سے ان کو ان الفاظ کا حل کرنا ہی ضروری تھا تو وہ اس کو نہج البلاغہ کا نام لکھ کر درج کرتے پھر واقعہ تو یہ ہے کہ اگر اس کو وہ کلامِ امیرالمومنینؑ سمجھتے ہی نہ تو انھیں اس کتاب میں، جو صرف احادیث اور آثار کے حل کے لیے لکھی گئی ہے، ان لغات کو جگہ ہی نہ دینا چاہیے تھی، کیونکہ اصطلاحی طور پر اثر صرف صحابہ اور ممتاز تابعین کی زبان

سے نکلے ہوئے اقوال کو کہتے ہیں۔ کسی متاخر عالم کی کتاب کے الفاظ نہ حدیث میں داخل ہیں اور نہ اثر میں۔ ان کا ان الفاظ کو جگہ دینا ہی اس کا ثبوت ہے کہ وہ اس کو سید رضی کا کلام نہیں سمجھتے بلکہ کلام امیرالمومنینؑ قرار دیتے ہیں۔ پھر یہ کہ ان لغات کو درج کرنے میں ہر مقام پر تصریحاً وہ حدیث علیؑ کی لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ جیسے لغت جوی میں منه حديث علي يونهي فتنق الاجواء و شق الارجاء میں زیادہ تر ان الفاظ کا تذکرہ حدیث علی کی لفظوں کے ساتھ ہے اور کہیں خطبة علی ہے جیسے لغت لوط میں في خطبة علي و لا طها بالبلة حتى لزبت۔ ایک جگہ لغت ایم میں یہ الفاظ ہیں: کلام علي مات قيها و طال تايمها۔ اسی طرح لغت اسل میں فی کلام علی کے الفاظ ہیں اور ایسے ہی دو، ایک جگہ اور باقی تمام مقامات پر حدیث علی لکھا ہے اور جو مکاتیب کے الفاظ ہیں، انھیں کتاب علی کہہ کر درج کیا ہے۔ ان تمام مقامات کو استقصا کے ساتھ ہم نے اپنی کتاب "نہج البلاغہ کا استناد" میں درج کیا ہے جو امامیہ مشن لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

(۴) علامہ سعد الدین تفتازانی، متوفی ۷۹۱ھ شرح مقاصد میں لکھتے ہیں و اذا هو افصحهم لسانا على ما يشهد به كتاب نهج البلاغة۔ حضرت سب سے زیادہ فصیح اللسان بھی تھے جس کی گواہی کتاب نہج البلاغہ دے رہی ہے۔

(۵) جمال الدین ابوالفضل محمد بن مکرم بن علی افریقی مصری، متوفی ۷۱۱ھ انھوں نے بھی نہایہ کی طرح اپنی عظیم الشان کتاب لسان العرب میں مندرجہ الفاظ کو کلام علیؑ کہتے ہوئے حل کیا ہے۔

(۶) علامہ علا الدین قوشجی، متوفی ۸۷۵ھ شرح تجرید میں قول محقق طوسی افصحهم لسانا کی شرح میں لکھتے ہیں: على ما يشهد به كتاب نهج البلاغة و قال البلغاء ان كلامه دون كلام الخالق و فوق كلام المخلوق جس کی شاہد ہے۔ آپ کی کتاب نہج البلاغہ اور اہل بلاغت کا قول ہے کہ آپ کا کلام خالق کے نیچے اور تمام مخلوق کے کلام سے بالاتر ہے۔

(۷) محمد بن علی بن طباطبا معروف بہ ابن طقطقی اپنی کتاب تاریخ الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ، مطبوعہ مصر، ص ۹ میں لکھتے ہیں:

عدل ناس الی نهج البلاغة من كلام امير المومنين على ابن ابی طالب فانه الكتاب الذی يتعلم منه الحكم و المواعظ و الخطب و التوحيد و الشجاعة و الزهد و علو الهمة و ادنىٰ فوائده الفصاحة و البلاغة۔

بہت سے لوگوں نے کتاب نہج البلاغہ کی طرف توجہ کی جو امیرالمومنینؑ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا کلام ہے، کیونکہ یہ وہ کتاب ہے کہ جس سے حکم اور مواعظ اور توحید اور زہد اور علو ہمت، ان تمام باتوں کی تعلیم حاصل ہوتی ہے اور اس کا سب سے ادنیٰ فیض فصاحت و بلاغت ہے۔

(۸) علامہ محدث ملا طاہر فتنی گجراتی انھوں نے بھی مجمع بحارالانوار، نہایہ کی طرح احادیث و آثار کے لغات ہی کی شرح میں لکھی ہے اور انھوں نے بھی الفاظ نہج البلاغہ کو کلام امیرالمومنینؑ تسلیم کرتے ہوئے ان کی شرح کی ہے۔

(۹) علامہ احمد بن منصور کازرونی اپنی کتاب مفتاح الفتوح میں امیرالمومنینؑ کے حالات میں لکھتے ہیں:

و من تامل فی كلامه و كتبه و خطبه و رسالاته علم ان علمه لا يوازی علم احد و فضائله لا تشاكل فضائل احد بعد محمد صلى الله عليه وسلم و من جملتها كتاب نهج البلاغه۔

جو حضرت کے کلام اور خطوط اور خطبوں اور تحریروں پر غور کی نگاہ ڈالے، اسے معلوم ہوگا کہ حضرت کا علم کسی دوسرے کے علم کی طرح اور حضرت کے فضائل پیغمبرؐ کے بعد کسی دوسرے کے فضائل کے قبیل سے نہیں تھے (یعنی بدرجہا زیادہ تھے)، اور انھیں

میں سے کتاب نہج البلاغہ ہے (اس کے معنی یہ ہیں کہ مصنف کے پیش نظر یہ حقیقت تھی کہ حضرت کے کلام کا ذخیرہ نہج البلاغہ کے علاوہ بھی کثرت کے ساتھ موجود ہے اور یہ صرف اس کا ایک جز ہے)۔

و ایم اللّٰہ لقد وقف دونہ فصاحۃ الفصحاء و بلاغۃ البلغاء و حکمۃ الحکماء۔

اور خدا کی قسم! آپ کی فصاحت کے سامنے تمام فصحا کی فصاحت اور بلیغوں کی بلاغت اور حکمائے روزگار کی حکمت مفلوج و معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔

(۱۰) علامہ یعقوب لاہوری شرح تہذیب الکلام میں افصح کی شرح میں لکھتے ہیں:

و من ارادا مشاھدۃ بلاغتہ و مسامعۃ فصاحتہ فلینظر الی نھج البلاغۃ و لا ینبغی ان ینسب ھذا الکلام البلیغ الی رجل شیعی۔

جو شخص آپ کی فصاحت کو دیکھنا اور آپ کی بلاغت کو سننا چاہتا ہو وہ نہج البلاغہ پر نظر کرے اور ایسے فصیح و بلیغ کلام کو کسی شیعہ عالم کی طرف منسوب کرنا بالکل غلط ہے۔

(۱۱) علامہ شیخ احمد ابن مصطفیٰ معروف بہ طاشکیری زادہ اپنی کتاب شقائق نعمانیہ فی علمائے دولت عثمانیہ قاضی قوام الدین یوسف کی تصانیف کی فہرست میں لکھتے ہیں: و شرح نھج البلاغۃ الامام الھمام علی بن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجھہ۔

(۱۲) مفتی دیارِ مصریہ علامہ شیخ محمد عبدہ، متوفی ۱۳۲۳ھ جن کی اس سعی جمیل کے مشکور ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے مصر اور بیروت وغیرہ

اہل سنت کے علمی مرکزوں کو نہج البلاغہ کے فیوض سے بہرہ مند بنانے کا سامان کیا اور وہاں کے باشندوں کو ان کے سبب سے اس جلیل القدر کتاب کا تعارف ہو سکا۔ انھوں نے نہج البلاغہ کو اپنے تفسیری حواشی کے ساتھ مصر میں چھپوایا جس کے بہت سے ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے اس مقدمے میں جو شروع کتابت میں درج کیا ہے، اپنی اس دہشت و حیرت کا اظہار کرتے ہوئے جو نہج البلاغہ کے حقائق آگیں عبارات سے ان پر طاری ہوئی ہے، تحریر کرتے ہیں:

کان یخیل الی فی کل مقام ان حرو باشبت و غارات شنت و ان للبلاغة دولة و للفصاحة صولة و ان الاوهام عرامة و للریب دعارة و ان جحافل الخطابة و کتائب الذرابة فی عقود النظام و صفوف الانتظام تنافح بالصفیح الابلج و القویم الاملج و تمشلج المهج بروائع الحجج فتفل من دعارة الوساوس و تصیب مقاتل الخوانس فما انا الا و الحق منتصر و الباطل منکسر و مرج الشک فی خمود و هرج الریب فی رکود و ان مدبر تلک الدولة و باسل تلک الصولة هو حامل لوائها الغالب امیر المومنین علی بن ابی طالب بل کنت کلما انتقلت من موضع الیٰ موضع احس بتغیر المشاهد و تحول المعاهد فتارة کنت اجدنی فی عالم یعمره من المعانی ارواح عالیه فی حلل من العبارات الزاهیة تطوف علی النفوس الزاکیة و تدنومن القلوب الصافیة توحی الیها رشادها و تقوم منها منا دها و تنفر بها عن مداحض المزال الیٰ جواد الفضل و الکمال و طورا کانت تنکشف لی الجمل عن وجوه با سره و انیاب کاشره و ارواح فی اشباح النمور و مخالب النسور قد تحفزت

للوثاب ثم انقضت للاختلاب فخلبت القلوب عن هواها
واخذت الخواطر دون مرماها و اغتالت فاسد الاهواء و
باطل الاراء و احيانا كنت اشهد ان عقلا نورانيا لا يشبه
خلقاً جسدانيا فصل عن الموكب الالهیٰ واتصل بالروح
الانسانی فخلعه عن غاشيات الطبيعة و سما به الی
الملكوت الاعلیٰ و نما به الیٰ مشهد النور الاجلیٰ و سكن به
الیٰ عمار جانب التقديس بعد استخلاصه من شوائب
التلبيس و آنات كانی اسمع خطيب الحكمة ينادی باعلياء
الكلمة و اولياء امر الامة يعرفهم مواقع الصواب و يبصرهم
مواضع الارتياب و يحذرهم مزلق الاضطراب و يرشدهم
الیٰ دقائق السياسة و يهديهم طرق الكياسة و يرتفع بهم الیٰ
منصات الرياسة و يصعدهم شرف التدبير و يشرف بهم
علیٰ حسن المصير ۔

ہر مقام پر (اس کے اثنائے مطالعہ میں) مجھے ایسا تصور ہو رہا تھا کہ جیسے لڑائیاں چھڑی ہوئی ہیں ، نبرد آزمائیاں ہو رہی ہیں ، بلاغت کا زور ہے اور فصاحت پوری قوت سے حملہ آور ہے ، توہمات شکست کھا رہے ہیں ، شکوک و شبہات پیچھے ہٹ رہے ہیں ، خطابت کے لشکر صف بستہ ہیں ، طلاقتِ لسان کی فوجیں شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں مصروف ہیں ؛ وسوسوں کا خون بہایا جا رہا ہے اور توہمات کی لاشیں گر رہی ہیں ۔ اور ایک دفعہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ بس حق غالب آگیا اور باطل کی شکست ہو گئی اور شک و شبہ کی آگ بجھ گئی اور تصوراتِ باطل کا زور ختم ہو گیا اور اس فتح و نصرت کا سہرا اس کے علم بردار اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب کے سر ہے ، بلکہ اس

کتاب کے مطالعے میں جتنا جتنا میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا، میں نے مناظرے کی تبدیلی اور مواقف کے تغیر کو محسوس کیا کبھی میں اپنے کو ایسے عالم میں پاتا تھا جہاں معانی کی بلند روحیں خوش نما عبارتوں کے جامے پہنے ہوئے پاکیزہ نفوس کے گرد چکر لگاتی اور صاف دلوں کے نزدیک آکر انھیں سیدھے راستے پر چلنے کا اشارہ کرتی اور نفسانی خواہشوں کا قلع قمع کرتی اور لغزش مقامات سے متنفر بنا کر فضیلت و کمال کے راستوں کا سالک بناتی ہیں۔ اور کبھی ایسے جملے سامنے آجاتے ہیں جو معلوم ہوتا ہے کہ تیوریاں چڑھائے ہوئے اور دانت نکالے ہوئے ہول ناک شکلوں میں آگے بڑھ رہے ہیں اور ایسی روحیں ہیں جو چیتوں کے پیکروں میں اور شکاری پرندوں کے پنجوں کے ساتھ حملے پر آمادہ ہیں اور ایک دم شکار پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور دلوں کو ان کے ہوا و ہوس کے مرکزوں سے جھپٹ کر لے جاتے ہیں اور ضمیروں کو پست جذبات سے زبردستی علیحدہ کر دیتے اور غلط خواہشوں اور باطل عقیدوں کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات میں جیسے مشاہدہ کرتا تھا کہ ایک نورانی عقل، جو جسمانی مخلوق سے کسی حیثیت سے بھی مشابہ نہیں ہے، خداوندی بارگاہ سے الگ ہوئی اور انسانی روح سے متصل ہو کر اسے طبیعت کے پردوں سے اور مادیت کے حجابوں سے نکال لیا اور اسے عالمِ ملکوت تک پہنچا دیا اور تجلیاتِ ربانی کے مرکز تک بلند کر دیا اور لے جا کر عالمِ قدس میں اس کو ساکن بنا دیا۔ اور بعض لمحات میں معلوم ہوتا تھا کہ حکمت کا خطیب صاحبانِ اقتدار اور قوم کے اہلِ حل و عقد کو للکار رہا ہے اور انھیں صحیح راستے پر چلنے کی دعوت دے رہا ہے اور ان کی غلطیوں پر متنبہ کر رہا ہے اور انھیں سیاست

کی باریکیاں اور تدبر و حکمت کے دقیق نکتے سمجھا رہا ہے اور ان کی صلاحیتوں کو حکومت کے منصب اور تدبر و سیاست کی اہلیت پیدا کر کے مکمل بنا رہا ہے۔

اس میں علامہ محمد عبدہ نے جس طرح یقینی طور پر اس کو کلام امیرالمومنین تسلیم کیا ہے، اسی طرح اس کے مضامین کی حقانیت اور اس کے مندرجات کی سچائی کا بھی اعتراف کیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اس کتاب کے مضامین حق کی فتح اور باطل کی شکست اور شکوک و اوہام کی فنا اور توہمات و وساوس کی بیخ کنی کا سبب ہیں اور وہ شروع سے آخر تک انسانی روح کے لیے روحانیت و طہارت اور جلال و کمال کی تعلیمات کے حامل ہیں۔

علامہ محمد عبدہ کو نہج البلاغہ سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ اسے قرآن مجید کے بعد ہر کتاب کے مقابلے میں ترجیح کا مستحق سمجھتے تھے اور انھوں نے اپنا یہ اعتقاد بتایا ہے کہ جامعۂ اسلامیہ میں اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونا اسلام کی ایک صحیح خدمت ہے اور یہ صرف اس لیے کہ وہ امیرالمومنینؑ ایسے بلند مرتبہ مصلح عالم کا کلام ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> لیس فی اھل ھذہ اللغة الاقائل بان کلام الامام علی ابن ابی طالب ھو اشرف الکلام و ابلغه۔ بعد کلام اللّٰہ تعالیٰ و کلام نبیه و اغزرہ مادة و ارفعه اسلوبا و اجمعه لجلائل المعانی فاجد بالطالبین لنفائس اللغة والطامعین فی التدرج المراقیھا ان یجعلو ھذا الکتاب اھم محفوظھم و افضل مأثورھم مع تفھم معانیه فی الاغراض التی جاءت لاجلھا و تامل الفاظه فی المعانی التی صیغت للدلالة علیھا لیصیبوا بذالک افضل غایة و ینتھوا الیٰ خیر نھایة۔

اس عربی زبان والوں میں کوئی ایسا نہیں جو اس کا قائل نہ ہو کہ

امیرالمومنینؑ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا کلام کلامِ خدا و کلامِ رسولؐ کے بعد ہر کلام سے بلند تر، زیادہ پرمعانی اور زیادہ فوائد کا حامل ہے، لہذا زبان عربی کے نفیس ذخیروں کے طلاب کے لیے یہ کتاب سب سے زیادہ مستحق ہے کہ وہ اسے اپنے محفوظات اور منقولات میں اہم درجے پر رکھیں اور اس کے ساتھ ان معانی و مقاصد کے سمجھنے کی کوشش کریں جو اس کتاب کے الفاظ میں مضمر ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ علامہ محمد عبدہ کی یہ کوشش پورے طور پر بارآور بھی ہوئی ایسے تنگ نظری کے ماحول میں جبکہ علمی دنیا کا یہ افسوس ناک رویہ ہے کہ خود اہلِ سنت کی وہ کتابیں جو اہلِ بیتِ معصومینؑ سے یا حضرتِ علیؑ ابن ابی طالبؑ سے متعلق ہیں، انھیں زیادہ تر ایران کے شیعی مطبعوں نے شائع کیا ہے مگر مصر و بیروت وغیرہ کے علمی مرکزوں نے انھیں کبھی قابلِ اشاعت نہ سمجھا۔ مثلاً سبطِ ابن جوزی کتبِ سیر میں پوری علمی جلالت سے یاد کیے گئے ہیں، مگر ان کی کتاب تذکرہ صرف اس لیے سوادِ اعظم کی بارگاہ میں درخورِ اعتنا نہیں سمجھی گئی کہ اس میں اہلِ بیتِ رسولؐ کے حالات زیادہ ہیں اسی طرح حافظ نسائی کی خصائص وغیرہ، مگر نہج البلاغہ اپنے تمام مندرجات کے باوجود جن سے سوادِ اعظم کو اختلاف ہو سکتا ہے، پھر بھی مصر اور بیروت کے علمی حلقوں میں پوری پوری مقبولیت اور مرکزیت رکھتی ہے، اس کے مسلسل ایڈیشن شائع ہوتے ہیں اور مدارس اور یونی ورسٹیوں کے نصابوں میں داخل ہے۔ یہ صرف ہندوستان یا پاکستان کی مناظرانہ ذہنیت اور اس کی مسموم فضا ہے کہ یہاں کے مدارس میں اکثر اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جاتا ہے جو خالص شیعی کتاب سے ہونا چاہیے۔ علامہ شیخ محمد عبدہ نے نہ صرف اس کتاب پر حواشی لکھ دیے اور اسے طبع کر دیا بلکہ وہ اپنی گفتگوؤں میں برابر اس کی تبلیغ کرتے رہتے تھے، چنانچہ مجلۂ الہلال مصر نے اپنی جلد نمبر ۳۵ کے شمارۂ اول بابت نومبر، ۱۹۲۶ء کے صفحہ

۷۸ پر چار سوالات علمی طبقے کی توجہ کے لیے شائع کیے تھے جن میں پہلا سوال یہ تھا:

ما هو الكتاب او الكتب التی طالعتموها فی شبابكم
فافادتكم و كان لها اثر فی حیاتكم۔

وہ کون سی کتاب یا کتابیں ہیں جن کا آپ نے دورِ شباب میں مطالعہ
کیا تو انھوں نے آپ کو فائدہ پہنچایا اور ان کا آپ کی زندگی پر اثر پڑا؟

اس سوال کا جواب جو استاد شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق نے دیا ہے، وہ شمارۂ دوم بابت دسمبر، ۱۹۲۶ء کے صفحہ ۱۵۰ پر شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

طالعت بارشاد الاستاذ المرحوم الشیخ محمد عبده دیوان
الحماسته و نهج البلاغة۔

میں نے استاد مرحوم شیخ محمد عبدہ کی ہدایت سے دیوان حماسہ اور نہج
البلاغہ کا مطالعہ کیا۔

عبدالمسیح انطاکی نے بھی، جن کی رائے اس کے بعد آئے گی، اس کا ذکر کیا کہ علامہ محمد عبدہ نے مجھ سے فرمایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ انشاپردازی کا درجہ حاصل کرو تو امیرالمومنینؑ حضرتِ علیؑ کو اپنا استاد بناؤ اور ان کے کلام کو اپنے لیے چراغ ہدایت قرار دو۔

موصوف کا یہ عقیدہ نہج البلاغہ کے متعلق کہ وہ تمام و کمال امیرالمومنینؑ کا کلام ہے، اتنا نمایاں تھا کہ ان کے تمام شاگرد، جو ان کے بعد سے اب تک مصر کے بلند پایہ اساتذہ میں رہے، اس حقیقت سے واقف تھے۔ چنانچہ استاد محمد محی الدین عبدالحمید، مدرس کلیہ لغتِ عربیہ جامعۂ ازہر، جن کے خود خیالات ان کی عبارت میں اس کے بعد پیش ہوں گے، اپنے شائع کردہ ایڈیشن کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

عسیت ان تسائل رأی الاستاذ الامام الشیخ محمد عبده
فی ذلک و هو الذی بعث الكتاب من مرقده و لم یكن احد
اوسع منه اطلاعاً و لا ادق تفكیر او الجواب علیٰ هذا تساؤل

ان نعتقد انه رحمه الله كان مقتنعاً بان الكتاب كله للامام علی رحمه اللہ۔

ممکن ہے تم اس بارے میں استاد امام شیخ محمد عبدہ کی رائے دریافت کرنا چاہتے ہو جنھوں نے اس کتاب کو خوابِ گمنامی سے بیدار کیا اور ان سے بڑھ کر کوئی وسعتِ اطلاع اور باریکی نگاہ میں مانا بھی نہیں جاسکتا، تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس کتاب کو تمام و کمال امیرالمومنینؑ کا کلام سمجھتے تھے۔

علامہ محمد عبدہ کا یہ مقدمہ جس کے اقتباسات ہم نے درج کیے ہیں، خود دنیائے ادبیت میں کافی اہمیت رکھتا ہے، چنانچہ سید احمد ہاشمی نے اپنی کتاب جواہرالادب، حصہ اول میں صفحہ ۳۱۷، ۳۱۸ پر اسے تمام و کمال درج کر دیا ہے اور اس پر عنوان قائم کیا ہے وصف نهج البلاغة للامام المرحوم الشيخ محمد عبده المتوفی ۱۳۲۲ھ۔

(۱۳) ملکِ عرب کے مشہور مصنف، خطیب اور انشا پرداز شیخ مصطفیٰ غلائینی استاذ التفسير و انفقه و لآداب العربيه فى الكلية الاسلاميه بيروت، اپنی کتاب اریج الزهر میں زیرِ عنوان نهج البلاغة و اساليب الكلام العربى ایک بسوط مقالے کے تحت میں تحریر کرتے ہیں:

من احسن ما ينبغى مطالعة لمن يتطلب الاسلوب العالى كتاب نهج البلاغه للامام علىٰ رضى الله عنه و هو الكتاب الذى انشأت هذا المقال لاجله فان فيه من بليغ الكلام و الاساليب المدهشة و المعانى الرائقة و مناحى الموضوعات الجليلة ما يجعل مطالعه اذ از اوله مز اولة صحيحة بليغا فى كتابته و خطابته و معانيه۔

بہترین چیز جس کا مطالعہ بلند معیارِ ادبی کے طلب گاروں کو لازم ہے، وہ امیرالمومنین علی علیہ السلام کی کتاب نہج البلاغہ ہے اور یہی وہ کتاب ہے جس کے لیے خاص طور پر یہ مقدمہ لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں بلیغ کلام اور ششدر کر دینے والے طرزِ بیان اور خوش نما مضامین اور مختلف عظیم الشان مطالب ایسے ہیں کہ مطالعہ کرنے والا اگر ان کی صحیح مزاولت کرے تو وہ اپنی انشا پردازی، اپنی خطابت اور اپنی گفتگو میں بلاغت کے معیار پر پورا اتر سکتا ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس کتاب سے کثیر التعداد افراد بلکہ اقوام نے استفادہ کیا ہے جن میں سے ایک کاتب الحروف بھی ہے۔ میں ان تمام افراد کو جو عربی کے بلند اسلوبِ تحریر کے طالب اور کلامِ بلیغ کے جویا ہوں، اس کتاب کے حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

(۱۴) استاذ محمد کرد علی رئیس مجمعِ علمی دمشق نے "الہلال" کے چار سوالات کے جواب میں جن میں سے تیسرا سوال یہ تھا کہ ماھی الکتب التی تنصحون لشبان الیوم بقر أتها: "وہ کون سی کتابیں ہیں جن کے پڑھنے کی موجودہ زمانے کے نوجوانوں کو آپ ہدایت کرتے ہیں؟" اس سوال کے جواب میں لکھا ہے:

اذا طلب البلاغة فی اتم مظاهرها ولفصاحة التی لم تشبهها عجمة فعلیک بنهج البلاغة دیوان خطب امیر المومنین علی بن ابی طالب و رسائله الیٰ عماله یرجع الیٰ فصل الانشاء والمنشئین فی کتابی۔

"القدیم والحدیث"

طبع بمصر ۱۹۲۵ء

اگر بلاغت کا اس کے مکمل ترین مظاہرات کے ساتھ مشاہدہ مطلوب ہو اور اس فصاحت کو جس میں ذرہ بھر بھی زبان کی کوتاہی

شامل نہیں ہے ، دیکھنا ہو تو تم کو نہج البلاغہ کا مطالعہ کرنا چاہیے جو امیر المومنین علی ابن ابی طالب کے خطب و مکاتیب کا مجموعہ ہے ۔ تفصیل کے لیے ہماری کتاب " القدیم و الحدیث " ، مطبوعہ مصر ۱۹۲۵ء فصل الانشا والمنشؤن دیکھنا چاہیے ۔

یہ جواب الہلال کی جلد نمبر پینتیس کے شمارہ نمبر ۵ بابت ماہِ مارچ ، ۱۹۲۷ء میں صفحہ ۵۷۲ پر شائع ہوا ہے ۔

(۱۵) استاذ محمد محی الدین المدرس فی کلیۃ اللغۃ العربیۃ بالجامع الازھر جنھوں نے نہج البلاغہ پر تعلیقات تحریر کیے ہیں اور علامہ شیخ محمد عبدہ کے حواشی برقرار رکھتے ہوئے بہت سے تحقیقات و شرح کا اضافہ کیا ہے اور ان حواشی کے ساتھ یہ کتاب مطبع استقامۃ مصر میں طبع ہوئی ہے ۔ انھوں نے اس ایڈیشن کے شروع میں اپنی جانب سے ایک مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جس میں نہج البلاغہ کے استناد و اعتبار پر ایک سیر حاصل بحث کی ہے ۔ اس کے ضروری اجزا یہاں درج کیے جاتے ہیں :

> و بعد فھذا کتاب نهج البلاغة و هو ما اختاره الشريف الرضی ابو الحسن محمد بن الحسن الموسوی من کلام امیر المومنین علی بن ابی طالب الذی جمع بین دفتیه عیون البلاغة و فنونها و تهياءت به للناظر فیه اسباب الفصاحة و دنا منه قطافها اذ کان من کلام افصح الخلق بعد الرسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم منطقا و اشدهم اقتدارا و ابرعهم حجة و املکهم لغة یدیرها کیف شاء الحکیم الذی تصدر الحکمة عن بیانه و الخطیب الذی یملاء القلب سحر لسانه العالم الذی تهیاله من خلاط الرسول و کتابة الوحی و الکفاح عن الدین بسیفه و لسانه منذ حداثته ما لم یتهیا لاحد سواه هذا

كتاب نهج البلاغة و انا به حفى منذ طراءة السن و ميعة الشباب فلقد كنت اجد والدى كثير القراءة فيه وكنت اجد عمى الاكبر يقضى معه طويل الساعات يردد عباراته و يستخرج معانيها و يتقبل اسلوبه و كان لهما من عظيم التاثير علىٰ نفسى ماجعلنى اقفو اثرهما فاحله من قلبى المحل الاول واجعله سميرى الذى لايمل و انيسى الذى اخلو اليه اذاعز الانيس۔

یہ کتاب نہج البلاغہ امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے کلام کا وہ انتخاب ہے جو شریف رضی ابوالحسن محمد بن حسن موسوی نے کیا ہے ۔ یہ وہ کتاب ہے جو اپنے دامن میں بلاغت کے نمایاں جوہر اور فصاحت کے بہترین مرقعے رکھتی ہے اور ایسا ہونا ہی چاہیے کیونکہ وہ ایسے شخص کا کلام ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تمام خلق میں سب سے زیادہ فصیح البیان، سب سے زیادہ قدرتِ کلام کا مالک اور قوتِ استدلال میں زیادہ اور الفاظِ لغتِ عربی پر سب سے زیادہ قابو رکھنے والا تھا کہ جس صورت سے چاہتا تھا، انھیں گردش دے دیتا تھا، اور وہ بلند مرتبہ حکیم جس کے بیان سے حکمت کے سوتے پھوٹتے ہیں، اور وہ خطیب جس کی جادو بیانی دلوں کو بھر دیتی ہے ۔ وہ عالم جس کے لیے پیغمبرِ خداؐ کے ساتھ انتہائی روابط اور وحی کی کتابت اور دین کی نصرت میں شمشیر و زبان دونوں سے جہاد کے ابتدائی عمر سے وہ مواقع حاصل ہوئے جو کسی دوسرے کو ان کے سوا حاصل نہیں ہوئے ۔ یہ ہے کتابِ نہج البلاغہ! اور میں اپنے عنفوانِ شباب اور ابتدائے عمر ہی سے اس کا گرویدہ رہا ہوں، کیونکہ میں اپنے والد کو دیکھتا تھا کہ وہ اکثر اس کتاب کو پڑھتے تھے اور اپنے

بڑے چچا کو بھی دیکھتا کہ وہ گھنٹوں پڑھتے رہتے، اس کے معانی کو سمجھتے رہتے اور اس کے اندازِ بیان پر غور کرتے رہتے۔ اور ان دونوں بزرگواروں کا میرے دل پر اتنا بڑا اثر تھا جس نے مجھے بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا اور میں نے اس کتاب کو اپنے قلب میں سب سے مقدم درجہ دے دیا، اسے اپنا مونسِ تنہائی قرار دیا جو ہمیشہ میرے لیے دل بستگی کا باعث ہے۔

اس کے بعد علامۂ مذکور نے ان اشخاص کا ذکر کیا ہے جن کا رجحان یہ ہے کہ وہ اسے شریف رضی کا خود کلام قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے موصوف رقم طراز ہیں، کہتے ہیں کہ سب سے اہم اسباب جو اس کتاب کے کلامِ امیرالمومنینؑ نہ ہونے سے متعلق پیش کیے جاتے ہیں، صرف چار ہیں۔ پہلے یہ کہ اس میں اصحابِ رسولؐ کی نسبت ایسے تعریضات ہیں جن کا حضرتِ علی علیہ السلام سے صادر ہونا تسلیم نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً معاویہ، طلحہٰ، زبیر، عمرو بن عاص اور ان کے اتباع کے بارے میں سب و شتم تک موجود ہے۔ دوسرے اس میں لفظی آرائش اور عبارت میں صنعت گری اس حد پر ہے جو حضرتِ علی علیہ السلام کے زمانے میں مفقود تھی۔ تیسرے اس میں تشبیہات و استعارات اور واقعات و مناظر کی صورت کشی اتنی مکمل ہے جس کا پتہ صدرِ اسلام میں اور کہیں نہیں ملتا۔ اس کے ساتھ حکمت و فلسفہ کی اصطلاحیں اور مسائل کے بیان میں اعداد کا پیش کرنا، یہ باتیں اس زمانے میں رائج نہ تھیں۔ چوتھے اس کتاب کی اکثر عبارتوں سے علمِ غیب کے ادعا کا پتہ چلتا ہے جو حضرتِ علیؑ ایسے پاک باز انسان کی شان سے بعید ہے۔

موصوف ان خیالات کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خدا گواہ ہے کہ ہمیں ان اسباب میں سے کسی ایک میں اور ان سب میں مجموعی طور پر بھی کوئی واقعی دلیل، بلکہ دلیل نما شکل بھی اس دعوے کے ثبوت میں نظر نہیں آتی جو ان لوگوں کا مدعا ہے، بلکہ انھیں تو ایسے شکوک و شبہات کا درجہ بھی

نہیں دیا جاسکتا جو کسی حقیقت کے ماننے میں تھوڑا سا دغدغہ بھی پیدا کرسکتے ہوں اور جن کے رفع کرنے کی ضرورت ہو، پھر انھوں نے ایک ایک کر کے ہر بات کو رد بھی کیا ہے۔ پہلی بات کے متعلق جو کچھ انھوں نے کہا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولؐ کے بعد مسئلۂ خلافت میں طرزِ عمل ہی ایسا اختیار کیا گیا جس سے فطرتاً حضرتِ علی علیہ السلام کو شکایت ہونا ہی چاہیے تھی اور آپ کی خلافت کے دور میں اہلِ شام نے آپ کے خلاف جو بغاوت کی، اس سے آپ کو تکلیف ہونا ہی چاہیے۔ ہر دور کے متعلق آپ کے جس طرح کے الفاظ ہیں، وہ بالکل تاریخی حالات کے مطابق ہیں، اس لیے اس میں شک وشبہ کا کیا محل ہے۔

دوسری اور تیسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ حضرتِ علی ابن ابی طالب کا سا مرتبۂ فصاحت اور حکمت دونوں میں کسی اور شخص کو حاصل نہیں تھا، تو پھر آپ کے کلام کی خصوصیتیں اس دور میں کسی اور کے یہاں مل ہی کیونکر سکتی ہیں۔ رہ گیا سجع و قافیہ کا التزام، وہ آپ کے یہاں اس طرح نہیں جس سے آورد ظاہر ہو یا معانی پر اس کا اثر پڑے اور اس حد تک قافیہ وغیرہ کا التزام اس دور میں عموماً رائج تھا۔

چوتھی دلیل کے جواب میں علامۂ مذکور نے جو کہا ہے، وہ ہمارے مذہبی عقائد کے بے شک مطابق نہیں ہے، مگر وہ خود ان کے نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جسے علمِ غیب سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسے ہم فراست اور زمانے کی نبض شناسی کا نتیجہ سمجھتے ہیں جو علیؑ ایسے حکیم انسان سے بعید نہیں ہے جیسا کہ ہم نے کہا۔ یہ جواب انھوں نے مادی ذہنیت کے مطابق دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا کے دیے ہوئے علمِ غیب کا مظاہرہ باعثِ انکار قرار دیا جائے تو اکثر احادیثِ نبویہ بھی اس زد میں آجائیں گی اور خدا کی طرف سے علمِ غیب کا مظاہرہ تو اکثر قرآن کی آیات سے نمودار ہی ہے، پھر قرآن کی آیتوں کا بھی انکار کرنا چاہیے۔ اور اگر علمِ الٰہی کی بنا پر ان آیات کو تسلیم کیا جائے تو اس کے عطا کردہ علم سے علیؑ ایسے عالمِ ربانی کے کلام

میں اس طرح کی باتوں کے تذکرے پر بھی کسی حرف گیری کا موقع نہیں ہے۔

(۱۶) استاذ شیخ محمد حسن نائل المرصفی نے بھی نہج البلاغہ کی ایک شرح لکھی ہے جو دارالکتب العربیہ سے شائع ہوئی ہے۔اس کے مقدمے میں کلمنه فی اللغته العربیه کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں:

و لقد كان المجلی فی هذه الحلبة علیٰ صلوات اللّٰه علیه وما حسبنی احتاج فی اثبات هذا الیٰ دلیل اکثر من نهج البلاغة ذلک الکتاب الذی اقامه اللّٰه حجة و اضحة علی ان علیاً رضی اللّٰه عنه قد کان احسن مثال حی لنور القرآن و حکمته و علمه و هدایته و اعجازه و فصاحته اجتمع لعلیؑ فی هذا الکتاب ما لم یجتمع لکبار الحکماء و افذاذ الفلاسفة و نوابغ الربانیین من آیات الحکمة السامیة و قواعد السیاسة المستقیمة و من کل موعظة باهرة و حجة بالغة تشهد له بالفضل و حسن الاثر خاض علی فی هذا الکتاب لجة العلم و السیاسة و الدین فکان فی کل هذه المسائل نابغة مبرزا۔

اس میدان میں سب سے آگے حضرتِ علیؑ ابن ابی طالب تھے اور اس دعوے کا سب سے بڑا ثبوت نہج البلاغہ ہے جسے اللہ نے ایک واضح حجت اس کی بنایا ہے کہ علیؑ ابن ابی طالب قرآن کے نور اور حکمت اور علم اور ہدایت اور اعجاز اور فصاحت کی بہترین زندہ مثال تھے۔اس میں حضرتِ علیؑ کی زبان سے اتنی چیزیں یک جا ہیں جو بڑے حکما اور یکتائے زمانہ فلاسفہ اور شہرۂ آفاق علمائے ربانیین، ان سب کی زبانی ملا کر بھی یک جا نہیں ملتیں۔ حکمت کی بلند نشانیاں اور صحیح سیاست کے قواعد، حیرت خیز موعظہ اور موثر استدلال اس کتاب میں علیؑ ابن ابی طالب نے علم سیاست اور دین

کے ہر دریا کی غواصی کی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ان میں سے ہر شعبے میں یکتائے روزگار تھے۔

(۱۷) استاذ محمد الزہری الغمراوی جنھوں نے مرصفی کی مذکورہَ بالا شرح پر ایک مقدمہ تحریر کیا ہے، اس میں طبقات الفصحا کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:

ولم ینقل عن احد من اهل هذه الطبقات ما نقل عن امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم الله وجهه فقد اشتملت مقالاته علی المواعظ الزهدیة والمناهج السیاسیة والزواجر الدینیة والحکم النفیسه والاداب الخلقیة والدرر التوحیدیة و الاشارات الغیبیة والردود علی الخصوم والنصائح علیٰ وجه العموم و قد احتوی علیٰ غرر کلامه کرم الله وجهه کتاب نهج البلاغة الذی جمعه و هذ به ابو الحسن محمد بن طاهر المشهور بالشریف الرضی رحمه الله و اثابه وارضاه۔

ان تمام طبقات کے لوگوں میں سے کسی ایک سے بھی وہ کارنامہ نقل ہو کر ہم تک نہیں پہنچا جو امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالب کرم اللہ وجہٗ کی زبانی پہنچا ہے۔آپ کے مقالاتِ زاہدانہ مواعظ، سیاسی مسلک اور دینی ہدایات، نفیس فلسفی بیانات، اخلاقی تعلیمات، توحید کے جواہر، غیبی اشارات، مخالفین کی رد و قدح اور عمومی نصائح پر مشتمل ہیں اور آپ کے کلام کے روشن اقتباسات پر مشتمل کتاب نہج البلاغہ ہے جسے ابوالحسن محمد ابن طاہر مشہور بہ شریف رضی رحمہ اللہ نے جمع کیا ہے۔

(۱۸) الاستاذ عبدالوهاب حموده استاذ الادب الحدیث بکلیة الآداب جامعه فواد الاول مصر نے اپنے مقالے الآرا الاجتماعیه فی نهج البلاغة

میں جو رسالۃ الاسلام قاہرہ کے جلد ۳، عدد ۳ بابت ماہِ رمضان ۱۳۷۰ھ، مطابق جولائی ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا ہے، لکھا ہے:

و قد اجتمع له رضی اللّٰه عنه فی کتاب نهج البلاغة ما یجتمع لکبار الحکماء و افذاذ الفلاسفة و نوابغ الربانیین من آیات الحکمة السامیة، قواعد السیاسة المستقیمة و من کل موعظة باهرة، و حجة بالغة و آراء اجتماعیة، و اسس حربیة، مما یشهد للامام بالفضل و حسن الاثر۔

حضرتِ علیؑ ابن ابی طالب کی زبان سے کتاب نہج البلاغہ میں تن تنہا وہ تمام چیزیں اکٹھا ہو گئی ہیں جو اکابر علما اور یکتائے روزگار فلاسفہ اور سربرآوردہ علمائے ربانیین سے مجموعی طور پر یک جا کی جا سکتی ہیں۔ بلند حکمت کی نشانیاں اور صحیح سیاست کے قواعد اور ہر طرح کا حیرت خیز موعظ اور موثر استدلال اور اجتماعی تصورات، یہ سب امیرالمومنینؑ کی فضیلت اور بہترین کارگزاری کا بین گواہ ہیں۔

(۱۹) علامہ ابونصر، پروفیسر بیروت یونی ورسٹی نے اپنی کتاب علی ابن ابی طالب کی فصل ۱۳ میں امیرالمومنینؑ کے آثارِ عربی میں نہج البلاغہ کا ذکر کیا ہے اور اس ذیل میں لکھا ہے کہ یہ کتاب علی ابن ابی طالب کی عظیم شخصیت کی مظہر ہے۔

(۲۰) قاضی علی ابن محمد شوکانی صاحب نیل الاوطار نے اپنی کتاب اتحاف الاکابر باسانید الدفاتر، طبع حیدرآباد (باب النون) میں نہج البلاغہ کے لیے اپنی سندِ متصل درج کرتے ہوئے لکھا ہے، نهج البلاغه من کلام علی رضی اللّٰه عنه:

"یہ وہ حقیقت ہے جس کا متعدد عیسائی محققین نے بھی اعتراف کیا ہے"۔

(۱) عبدالمسیح انطاکی صاحب جریدۂ "العمران" مصر جنھوں نے امیرالمومنینؑ کی سیرت میں اپنی مشہور کتاب "شرح قصیدۂ علویہ" تحریر کی ہے اور وہ مطبع رعمسیس فجالہ مصر میں شائع ہوئی ہے، وہ اس کے ص ۵۳۰ پر تحریر کرتے ہیں:

لا جدال ان سيدنا علياً امیر المومنین هو امام الفصحآء و استاذ البلغاء و اعظم من خطب و کتب فی حرف اهل هذه الصناعة الالبآء و هذا کلام قد قیل فیه بحق انه فوق کلام الخلق و تحت کلام الخالق قال هذا کل من عرف فنون الکتابة و اشتغل فی صناعة التحبير و التحرير بل هو استاذ کتاب العرب و معلمهم بلا مراء فما من ادیب لبیب حاول اتقان صناعة التحرير الا و بين يديه القرآن و نهج البلاغة ذاک کلام الخالق و هذا کلام اشرف المخلوقین و علیهما یعول فی التحریر و تحبیر اذا اراد ان یکون فی معاشر الکتبة المجیدین و لعل افضل من خدم لغة قریش الشریف الرضی الذی جمع خطب و اقوال و حکم و رسائل سیدنا امیر المومنین من افواه الناس و امالیهم و اصاب کل الاصابة باطلاقه علیه اسم " نهج البلاغة " و ما هذا الکتاب الاصراطها المستقیم لمن یحاول الوصول الیها من معاشر المتادبین۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ سیدنا حضرتِ علیؑ امیرالمومنینؑ فصیحوں کے امام اور بلیغوں کے استاد اور عربی زبان میں خطابت اور کتابت کرنے والوں میں سب سے زیادہ عظیم المرتبت ہیں ۔ اور یہ وہ کلام ہے جس کے بارے میں بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ یہ کلامِ خلق سے بالا اور خالق کلام سے نیچے ہے ۔ یہ ہر اس شخص کا قول ہو گا جس نے انشا پردازی کے فنون سے واقفیت حاصل کی ہو اور تحریر کا مشغلہ رکھا ہو ، بلکہ آپ بلاشبہ تمام عرب انشا پردازوں کے استاد اور معلم ہیں ۔ کوئی ادیب ایسا نہیں ہے جو تحریر کے فن میں کمال

حاصل کرنا چاہے مگر یہ کہ اس کے سامنے قرآن ہوگا اور نہج البلاغہ،
کہ ایک خالق کا کلام ہے اور دوسرا اشرف المخلوقین کا اور انھیں پر
اعتماد کرے گا ہر وہ شخص جو چاہے گا کہ اچھے لکھنے والوں میں اس کا
شمار ہو۔ غالباً زبان عربی کی خدمت کرنے والوں میں سب سے بڑا
درجہ شریف رضی کا ہے جنھوں نے امیرالمومنینؑ کے یہ خطبے اور
اقوال اور حکیمانہ ارشادات اور خطوط لوگوں کے محفوظات اور
مخطوطات سے یک جا کیے ہیں اور انھوں نے اس کا نام "نہج البلاغہ"
بھی بہت ٹھیک رکھا۔ بلاشبہ یہ بلاغت کا صراطِ مستقیم ہے ہر
اس شخص کے لیے جو اس منزل تک پہنچنا چاہے۔

اس کے بعد انھوں نے شیخ محمد عبدہ کی رائے بیان کی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شیخ ابراہیم یازجی نے، جو اس آخری دور میں متفقہ طور پر عربی کے کامل انشا پرداز اور امامِ اساتذۂ لغت مانے گئے ہیں، مجھ سے فرمایا کہ مجھے اس فن میں جو مہارت حاصل ہوئی ہے، وہ صرف قرآن مجید اور نہج البلاغہ کے مطالعے سے۔ یہ دونوں عربی زبان کے وہ خزانۂ عامرہ ہیں جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔

(۲) فواد افراہم البستانی، استاذ الآداب العربیہ فی کلیتہ القدیس یوسف (بیروت)۔ انھوں نے ایک سلسلہ تعلیمی کتابوں کا روائع کے نام سے شروع کیا ہے جس میں مختلف جلیل المرتبہ مصنفین کے آثارِ قلمی اور تصانیف سے مختصر انتخابات مصنف کے حالات، کمالات، کتاب کی تاریخی تحقیقات وغیرہ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے مجموعوں کی صورت میں ترتیب دیے ہیں اور وہ کیتھلک عیسائی پریس (بیروت) میں شائع ہوئے ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا مجموعہ امیرالمومنینؑ اور نہج البلاغہ سے متعلق ہے جس کے بارے میں مولف نے اپنے مقدمے میں تحریر کیا ہے:

انا نبدأ الیوم بنشر منتخبات من نهج البلاغة للامام علی ابن
ابی طالب اول مفکری الاسلام۔

ہم سب سے پہلے اس سلسلے کے ابتدا کرتے ہیں کچھ انتخابات کے
ساتھ نہج البلاغہ کے جو اسلام کے سب سے پہلے مفکرِ امام علیؑ ابن ابی
طالب کی کتاب ہے۔

اس کے بعد وہ سلسلہ شروع ہوا ہے جو سلسلۂ روائع کی پہلی قسط ہے۔ اس کا پہلا عنوان ہے "علیؑ ابن ابی طالب" جس کے مختلف عناوین کے تحت میں امیرالمومنینؑ کی سیرت اور حضرت کے خصوصیاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے جو ایک عیسائی کی تحریر ہوتے ہوئے پورے طور سے شیعی نقطۂ نظر کے موافق نہ سہی، لیکن پھر بھی حقیقت و انصاف کے بہت سے جوہر اپنے دامن میں رکھتی ہے۔ دوسرا عنوان ہے "نہج البلاغہ" اور اس کے ذیلی عناوین میں ایک عنوان ہے "جمعہ"، دوسرا عنوان ہے "صحۃ نسبتہ"۔ اس کے تحت میں لکھا ہے: "نہج البلاغہ کے جمع و تالیف کو بہت زمانہ نہیں گزرا تھا کہ بعض اہل نظر اور مورخین نے اس کی صحت میں شک کرنا شروع کیا۔ ان کا پیشرو ابن خلکان ہے جس نے اس کتاب کو اس کے جامع کی طرف منسوب کیا ہے اور پھر صفدی وغیرہ نے اس کی پیروی کی اور پھر شریف رضی کے بسا اوقات اپنے دادا مرتضیٰ کے لقب سے یاد کیے جانے کی وجہ سے بعض لوگوں کو دھوکا ہو گیا اور وہ ان میں اور ان کے بھائی علی بن طاہر معروف بہ سید مرتضیٰ، متولد ۹۶۶ء، متوفی ۱۰۴۴ء میں تفرقہ نہ سمجھ سکے اور انھوں نے نہج البلاغہ کے جمع کو ثانی الذکر کی طرف منسوب کر دیا جیسا کہ جرجی زیدان نے کیا ہے۔ اور بعض لوگوں نے جیسے مستشرق کلیمان نے یہ طرہ کیا کہ اصل مصنف کتاب کا سید مرتضیٰ ہی کو قرار دے دیا۔ ہم جب اس شک کے وجوہ واسباب پر غور کرتے ہیں تو وہ ہر پھر کے پانچ امر ہوتے ہیں"۔

اس کے بعد انھوں نے شک کے وہی اسباب تقریباً تحریر کیے ہیں جو اس کے پہلے محی الدین عبدالحمید شارح نہج البلاغہ کے بیان میں گزر چکے ہیں اور پھر انھوں نے ان وجوہ کو رد کیا ہے۔

(۳) بیروت کے شہرۂ آفاق مسیحی ادیب اور شاعر پولس سلامہ اپنی کتاب "اول ملحمہ عربیہ عید الغدیر" میں جو مطبعۃ النسر، بیروت میں شائع ہوئی ہے، صفحہ ۱۷، ۲۷ پر لکھتے ہیں: "نہج البلاغہ مشہور ترین کتاب ہے جس میں امام علی علیہ السلام کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اس کتاب سے بالاتر سوا قرآن کے اور کسی کتاب کی بلاغت نظر نہیں آتی۔ اس کے بعد حسبِ ذیل اشعار نہج البلاغہ کی مدح میں درج کیے گئے ہیں:

هذه الكهف للمعارف باب	مشرع من مدينه الاسرار
تنثر الدرٰ فی کتاب مبین	سفر نهج البلاغة المختار
هو روض من کل زهر جنی	اطلعته السماء فی نوار
فيه من نضرة الورد العذاری	والخزامی والفد و الجلنار
فی صفاءِ الینبوع یجری زلا لا	کوثر ارانقا بعید القرار
تلمع الشط والصفاف ولکن	بالعجز العیون فی الاغوار

یہ معارف و علوم کا مرکز اور اسرار و رموز کا کھلا ہوا دروازہ ہے۔

یہ نہج البلاغہ کیا ہے؟ ایک روشن کتاب میں بکھرے ہوئے موتی۔

یہ چنے ہوئے پھولوں کا ایک باغ ہے جس میں پھولوں کی لطافت، چشموں کی صفائی اور آبِ کوثر کی شیرینی، نہر کی وسعت اور کنارے تو آنکھوں سے نظر آتے ہیں مگر تہ تک نظریں پہنچنے سے قاصر ہیں"۔

مذکورۂ بالا ادبائے محدثین کے کلام سے نہج البلاغہ کی لفظی اور معنوی اہمیت بھی ضمناً ثابت ہو گئی ہے۔ اب اس کے متعلق مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اب رہ گیا ہمارے فنی اصول سے اس کتاب کا وہ درجہ جس اعتبار سے ہم اس سے استدلال کر سکتے ہیں، تو مجموعی طور پر ہمارے نزدیک اس کتاب کے مندرجات کی نسبت امیر المومنینؑ کی جانب اسی حد تک ثابت ہے جیسے صحیفۂ کاملہ کی نسبت امام زین العابدین کی جانب یا کتبِ اربعہ کی نسبت ان کے مصنفین کی طرف یا معلقاتِ

سبعہ کی نسبت ان کے نظم کرنے والوں کی جانب ۔ رہ گیا خصوصی عبارات اور الفاظ میں سے ہر ایک کی نسبت اطمینان ، وہ اسلوبِ کلام اور اندازِ بیان سے وابستہ ہے اور ان مندرجات کے مطابقت کے اعتبار سے ہے ان ماخذوں کے ساتھ جو صحیح طور پر ہمارے یہاں مسلم الثبوت ہیں ۔ اصطلاحی حیثیت سے قدما کی تعریف کے مطابق جو صحتِ خبر کے لیے وثوق بالصدور کو کافی سمجھتے ہیں ، ان شرائط کے بعد اس کا ہر جزِ صحیح کی تعریف میں داخل ہے ۔ اور متاخرین کی اصطلاح کے مطابق جو صحت کو باعتبارِ صفاتِ راوی قرار دیتے ہیں ، نہج البلاغہ کے مندرجات کو مرسلات کی حیثیت حاصل ہے ۔ مرسلات کی اہمیت ارسال کرنے والے کی شخصیت کے اعتبار سے ہوتی ہے ، یہاں تک کہ ابن ابی عمیر اور بعض جلیل القدر اصحاب کے بارے میں علمائ نے یہ رائے قائم کرلی ہے کہ ان تک جب خبر کی صحت ثابت ہوجائے تو پھر ان کے آگے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کون راوی ہے ، اس لیے کہ ان کا نقل کرنا خود اس کے اعتبار کی دلیل ہے اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ مرسلات ابن ابی عمیر حکمِ مسند میں ہیں ۔ اس بنا پر خود جناب سید رضی اعلی اللہ مقامہٗ کی جلالتِ قدر ضرور اسے عام مرسلات سے ممتاز کردیتی ہیں ، پھر بھی مواعظ و تواریخ وغیرہ کا ذکر نہیں جس میں عقیدہ و عمل ایسی اہمیت نہیں ہے ۔ لیکن مقامِ اعتقاد و عمل میں ہم نہج البلاغہ کے مندرجات کو اور ادلہ کے ساتھ ، جو اس باب میں موجود ہوں ، اصول تعادل و تراجیح کے معیار پر جانچیں گے اور بعض موقعوں پر ممکن ہے جو مسند حدیث اس موضوع میں موجود ہو ، اس پر نہج البلاغہ کی روایت کو ترجیح ہوجائے اور بعض مقاموں پر ممکن ہے تکافؤ ہوجائے اور بعض جگہ شاید ان دوسرے ادلہ کو ترجیح ہوجائے ، لیکن اس سے نہج البلاغہ کی مجموعی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ اس کا وزن اسی طرح برقرار رہنا ہے جس طرح کافی کی بعض حدیثوں کو کسی وجہ سے نظر انداز کرنے کے بعد بھی کافی کا وزن مسلم ہے ۔

بہرصورت نہج البلاغہ کی علمی و ادبی و مذہبی اہمیت اور اس کے حقائق آگئیں

مضامین اور اخلاقی مواعظ کا وزن ناقابل انکار ہے، مگر ظاہر ہے کہ نہج البلاغہ سے صحیح فائدہ وہی افراد اٹھا سکتے ہیں جو عربی زبان میں مہارت رکھتے ہوں۔ غیر عربی داں اس خزینۂ عامرہ سے فیض حاصل کرنے سے قاصر ہیں، اسی لیے ایرانی فضلا و علما کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اس کے فارسی ترجمے شائع کریں، چنانچہ متعدد ترجمے ایران میں اس کے شائع ہوتے رہے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اردو زبان میں ابھی تک نہج البلاغہ کا کوئی قابل اطمینان ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ بعض ترجمے جو شائع ہوئے، ان میں سے کسی میں اغلاط بہت زیادہ تھے اور کسی میں عبارت آرائی نے ترجمے کے حدود کو باقی نہیں رکھا، نیز حواشی میں کبھی خالص مناظرانہ انداز کی بہتات ہو گئی اور کبھی اختصار کی شدت نے ضروری مطالب نظر انداز کر دیے۔ جناب مولانا مفتی جعفر حسین صاحب جو ہندوستان و پاکستان میں کسی تعارف کے محتاج نہیں اور اپنے علمی کمالات کے ساتھ بلند سیرت اور سادگی معاشرت میں جن کی ذات ہندوستان اور پاکستان میں ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے، ان کی یہ کوشش نہایت قابل قدر ہے کہ انھوں نے اس کتاب کے مکمل ترجمے اور شارحانہ حواشی کے تحریر کا بیڑا اٹھایا اور کافی محنت و عرق ریزی سے اس کام کی تکمیل فرمائی۔ بغیر کسی شک و شبہ کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب تک ہماری زبان میں جتنے ترجمے اس کتاب کے اور حواشی شائع ہوئے ہیں، ان سب میں اس ترجمے کا مرتبہ اپنی صحت اور سلاست اور حسن اسلوب میں یقیناً بلند ہے اور حواشی میں بھی ضروری مطالب کے بیان میں کمی نہیں کی گئی اور زوائد کے درج کرنے سے احتراز کیا ہے۔ بلاشبہ نہج البلاغہ کے ضروری مندرجات اور اہم نکات پر مطلع کرنے کے لیے اس تالیف نے ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے جس پر مصنف ممدوح قابل مبارک باد ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ صاحبان ذوق ہر طبقے کے اس کتاب کا ویسا ہی خیر مقدم کریں گے جس کی وہ مستحق ہے۔ جزی اللّٰہ مؤلفہ فی الدارین خیرا۔

حقیقتِ اسلام

حجۃ الاسلام سید العلمائ مولانا سید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سیدنا محمد

سید المرسلین وآلہ الطیبین الطاہرین

"اسلام" گویا ایک "خواب" تھا جسے "کثرتِ تعبیر" نے پریشاں بنا دیا۔ کوئی کہتا ہے کہ اسلام فقط کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکاۃ کا نام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص شہادتین کا اقرار کرتا ہو اور ان عبادات کا پابند ہو تو وہ سچا مسلمان ہے، چاہے اپنے اخلاق میں وہ کتنا ہی پست اور دوسروں سے معاملات میں کتنا ہی کھوٹا کیوں نہ ہو۔ اسلام کی اسی تعبیر کی بنا پر آج مردم شماری کی بنیاد ہے اور میں بھی اسلام کے رسمی احکام کے لحاظ سے اسے مان لوں گا، مگر یاد رکھنا چاہیے کہ قانونی طور پر مسلمانوں کے خانے میں نام درج ہو جانا اور چیز ہے اور حقیقی مسلمان ہونا دوسری چیز ہے۔ کیا ایسے ہی مسلمان وہ ہو سکتے ہیں کہ جنھیں خدا نے دنیا کی آبادی کا ذریعہ قرار دیا ہے اور ان ہی لوگوں سے فانتم الاعلون (تم سب سے بلند رہو گے) کا وعدہ پورا ہو سکتا ہے اور یہی وہ ہیں جو زمین کے حاکم اور مالک بنائے جا سکیں؟ اس خیال کا ردِ عمل یہ تھا کہ بعض لوگوں کو اس کا احساس شدید پیدا ہو گیا کہ یہ چیزیں اسلام کی بنیاد اساسی نہیں ہو سکتیں۔ انھوں نے اسلام کی تفسیر "غلبہ و اقتدار" سے کر لی اور ذوقِ جہاں بانی و شوقِ حکمرانی ہی کو سب کچھ سمجھ لیا اور نظامِ عسکریت کو اس کا اصل اصول قرار دیا، مگر کیا یہ اسلام کی صحیح تفسیر ہے؟ ہرگز نہیں! اگر اسے صحیح مانا جائے تو بڑے بڑے ظالم سلاطین، جنھیں یہ ذوقِ ملک گیری بہت شدید تھا،

سچے مسلمان سمجھے جائیں، مسلمان کا نام محدود ہوجائے، نپولین، تیمور اور نادر میں اور آج ہٹلر اور مسولینی سب سے بڑے مسلمان ہوں، مگر کیا "اسلام" کی پاک دامنی اور صلح پسندی اس تعبیر کی متحمل ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں! کیا ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں، مسجد کی محرابوں، بازار تجارت میں سچے مسلمانوں کا وجود نہیں ہوسکتا؟ کیا رسول اللہ کی مسجد کے اصحابِ صفہ اور سلمان، ابوذر کے ایسے لوگ، جو میدانِ جنگ کے شہ سوار نہیں تھے، اسلام سے محروم سمجھے جائیں گے؟ کیا بے موقع اور بے محل اقدامِ جنگ بھی اسلام کی حقیقی روح ہوگا؟ اور کیا زمانۂ امن و صلح میں بھی نظامِ عسکری ہی مذہب کا مستقل آئین سمجھا جائے گا؟ کچھ لوگوں نے اس کے ساتھ اطاعتِ حاکم اور ذوقِ انقیاد کو بڑی چیز سمجھا اور اسے اسلام کے اصول میں خاص اہمیت دے دی، مگر کیا ہر حاکم کی اطاعت اسلام کا مقصد ہوسکتا ہے؟ اور ہر ایک کے سامنے سر جھکا دینا اس کا نصب العین بن سکتا ہے؟

اصل حقیقت یہ ہے کہ ان تمام لوگوں نے اسلام کے وسیع و مکمل مفہوم میں سے ایک ایک جزو لے لیا ہے اور اسی کو سب کچھ قرار دے کر حد سے بڑھا دیا ہے۔

"حقیقتِ اسلام" ایک بلند اور کامل نصب العین ہے جس میں کلمہ، نماز، روزہ، حج اور زکاۃ بھی داخل ہیں۔ بلند مقاصد کی حفاظت کے لیے سرفروشی و جاں بازی بھی اس کا ایک جزو ہے۔ نظامِ عسکری بھی ان مقاصد کے تحفظ کے لیے ضروری ہے اور اطاعتِ حاکم بھی ان اصولوں کے ماتحت جو حقائق اسلام کے محافظ ہوں، ضروری قرار دی گئی ہے اور اس کے علاوہ بہت سے وہ شعبے ہیں جو مذکورہ حدود میں داخل نہیں ہوتے۔

"اسلام" مجموعہ ہے عقائد اور اعمال کا۔ عقائد وہ جو عمل کا احساس پیدا کرنے والے ہیں، اعمال وہ جو عقیدے پر چلا کرنے والے ہیں، عقائد وہ جو تمام خلائق کے مقابلے میں خودداری اور خود اعتمادی پیدا کرنے والے، اعمال وہ جو دنیا

کی شیرازہ بندی کرنے والے اور اجتماعی نظام کو قوت پہنچانے والے ، عقائد وہ جو اصلاح کی دعوت دینے والے ، اعمال وہ جو اصلاح کے مقصد کی تکمیل کرنے والے ہیں ۔ اسلام کی حقیقت کے لیے اگر ہم ایک جامع لفظ تلاش کرنا چاہیں تو وہ صرف " فرض شناسی " ہے ۔ اسی کو وسعت دیجیے تو عقائد اور اعمال کی پوری دنیا آجائے ۔ تمام عقائد اسی فرض شناسی کے جذبے کو بیدار کرنے والے اور تمام اعمال اسی فرض شناسی کے خارجی مظاہرے ہیں ۔ اسی فرض شناسی میں حقوق اللہ داخل ہیں ، اسی میں حقوق الناس ، اسی میں اچھائیوں کی پابندی مضمر ہے ، اسی میں برائیوں سے علیحدگی ۔ اسی میں حاکم کی اطاعت درج ہے اور اسی میں نظامِ اجتماعی کا استحکام اور مرکز کا متحد ہونا بھی مشترک فرائض کی تکمیل کی ایک لازمی شرط ہے ۔

یہ خیال کرنا کہ اسلام بس کلمہ نماز ، روزہ ، حج ، زکاۃ میں مکمل ہو جاتا ہے ، درست نہیں ہے ۔ آخر سچائی ، انصاف ، امانت داری ، حفاظت شناسی کا بھی تو کوئی درجہ ہے اور جہاد فی سبیل اللہ بھی تو کوئی چیز ہے !

اسی طرح یہ سمجھنا کہ اسلام بس غلبہ واقتدار اور نظامِ عسکری کی تکمیل کا نام ہے ، یہ بھی غلط ہے ۔ اس کے ساتھ رحم وکرم ، مواسات وایثار اور خدا کی بندگی کے انفرادی فرائض اور حقوقِ خلق کا لحاظ بھی تو ضروری ہے ۔ وہ مسلمان کیا کریں جنھیں ناسازگار فضا میں رہنا ہو ، جہاں حصولِ اقتدار کا کوئی موقع نہ ہو اور نظامِ عسکری کا وجود نہ ہوسکے ؟ کیا یہ لوگ اپنے تئیں مسلمان نہ سمجھیں ؟ اس لیے کہ اسلام کی طرف سے اب ان کے لیے کوئی نصب العین باقی نہیں رہا ۔ وہ مسلمان جو تقسیمِ عمل کی بنا پر دوسرے اقتصادی اور عملی کام انجام دیتے ہیں اور فوجی نظام میں داخل نہیں ہوسکتے کیا وہ اپنے تئیں حقیقتِ اسلام سے بے گانہ سمجھ لیں ؟ اور کیا جس وقت مستقل امن قائم ہو جائے اور نظامِ عسکری کی ضرورت باقی نہ رہے ، اس وقت کے لیے اسلام کا کوئی نظام نہیں ہے ؟ اور کیا اس وقت خود اسلام کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی ؟

حاکم کی اطاعت فرض ہے ، مگر بڑا غلط خیال ہے یہ کہ مسلمانوں کا ہر بادشاہ

امام اور اس کی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ مسلمانوں کے بادشاہوں میں ایسے اشخاص بھی ہوسکتے ہیں جو قرآنی تعلیمات کے خلاف احکام نافذ کریں، ایسے بادشاہ بھی ہوسکتے ہیں جو قرآن کو فراموش کر دینا چاہیں، بلکہ ایسے بادشاہ بھی ہوسکتے ہیں جو خدا پرستی کے بجائے عملی طور سے اپنی پرستش کی طرف دعوت دیں۔ کیا ایسے بادشاہوں کی اطاعت خدا کی طرف سے فرض ہوگی؟ کیا اسلامی بادشاہ اگر نمرودیت، فرعونیت اور شدادیت کا مجسمہ بن جائیں تب بھی سچے مسلمان ان کی اطاعت کو ضروری سمجھیں، اور کیا ابراہیمیت اور موسویت کی طاقتوں کو اس وقت محوِ خواب ہی رہنا چاہیے؟ اس صورت میں تو اسلام کا دنیا میں کوئی نصب العین اور مقصد ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ وہ نام ہوگا مختلف بادشاہوں کی متضاد سیاستوں کا جو زمانے کی رفتار کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں اور جس میں ہر ظلم، ناانصافی، بے باکی اور غلط کاری کی گنجائش ہے۔ اگر حقیقتِ اسلام ان میں سے ہر ایک کی اطاعت کا نام ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ بسا اوقات اسلام نام ہوگا سفاکی کا، ظلم کا، قتل و غارت کا، ہوس رانی کا اور نہ معلوم کاہے کاہے کا جن باتوں پر انسانیت نفرین کرتی ہے اور تمدن و تہذیب جنھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

مرکز کو مضبوط کرنا نظامِ اجتماعی کے لیے یقیناً ضروری ہے، مگر مرکز کے انتخاب میں بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ اگر مرکزی نقطے کی تعیین میں غلطی ہوگی تو پورا دائرۂ اجتماعی غلط ہوجائے گا اور اسلام کا تمام نظام اپنے محور سے ہٹ جائے گا۔ ایک مجلس قانون ساز کو مرکزی حقوق کا سپرد کر دینا اسی وقت صحیح رہ نمائی کا ضامن ہوسکتا ہے جب اس کے افراد ہوا و ہوس، خواہش نام و نمود، بے جا ضد اور بے محل حفاظتِ وقار کے جذبات سے بالاتر ہوں، ورنہ دنیا میں بہت سی مجلسیں بنتی ہیں جو اشخاص کے ذاتی اقتدار کا آلۂ کار ہوتی ہیں اور جمہور کو دھوکا دے کر ان کے سر پر مسلط رہتی اور ان کو نفع کے بجائے نقصان پہنچاتی ہیں۔ مرکز کی شخصی یا مجلسی مطلق العنانی کا سدِ باب قرآن کے ذریعے سے ہرگز نہیں ہوسکتا، کیونکہ قرآن

خود تعبیرات کا پابند ہے ، اس لیے مرکز یا مجلسِ قانون ساز جیسی چاہے گا ، ویسی اس کی تعبیر کر دے گا ، چاہے حقیقتہً وہ صحیح ہو یا غلط ۔ جب تک مرکز خود ایسا نہ ہو جو تعلیماتِ اسلامی کی روح کا محافظ ہو ، اس وقت تک قرآنی دستور العمل بالکل ناکافی ہے ۔

اس وقت ہم آپ کے سامنے اسلام کے اصول و فروع کے متعلق ایک واضح بیان پیش کرنا چاہتے ہیں ، ممکن ہے اس سے آپ کو " حقیقتِ اسلام " کا سراغ مل سکے ۔

اصولِ دین

اسلامِ حقیقی کے اصول حسبِ ذیل ہیں :

(۱) توحید (۲) عدل (۳) نبوت (۴) امامت (۵) معاد

اب آپ ان میں سے ہر ایک پر غور فرمائیے ۔

توحید : یہ اصل اصول اور بنیاد اساسی ہے ۔ اس میں تمام عالمِ انسانیت کو ایک مشترکہ نقطے کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے جو سب کا مرکز قرار پائے (۱) ۔ ہزار دو ہزار نسل ، وطن ، قوم اور رنگ کے تفرقوں کے باوجود دنیا منسلک ہو جاتی ہے ایک نظام میں اس ایک ہستی کے اقرار سے جو سب کا خالق اور معبود ہے (۲) ۔ اس میں احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ انسان مطلق العنان نہیں ہے ۔ اگر سب ذاتی خواہشوں کے غلام ہوتے تو ہر ایک کی طبیعت اور خواہش کے اختلاف سے عمل اور مقصد میں اختلاف پیدا ہو سکتا تھا (۳) ، مگر یہ سب ایک حاکم کے فرماں بردار ہیں ، اس لیے ان کا آہنگِ عمل اور مقصد ایک ہونا چاہیے ۔ یہ حاکم کیسا ہے ؟ حاضر و ناظر ہے (۴) ، ہر جگہ موجود ہے اور ہر بات کو جانتا ہے (۵) ۔ اس لیے انسان کو ہوشیار رہنا چاہیے کہ کوئی بات خلافِ قانون نہ بجا لائے ، کسی کام کو چوری چھپے کر کے

مطمئن نہ ہو جائے کہ کسی نے نہیں دیکھا، کیونکہ اس نے دیکھ لیا جس کے ہاتھ میں جزا اور سزا ہے (۶) ۔ وہ ایک اکیلا ہے، کوئی اس کا مثل و مقابل نہیں، اس لیے بس اسی کی رضامندی کی فکر رہنا چاہیے اور اسی کی ناراضگی سے اندیشہ کرنا چاہیے (۷) ۔ اس کی طاقت ہر ایک سے غالب ہے (۸)، اس لیے ناحق کسی کی طاقت سے مرعوب نہ ہو ۔ وہ ہر بات پر قادر ہے (۹)، اس لیے کسی دشوار بات کو ناممکن نہ سمجھو ۔ وہ ہر کمزوری کا آخری سہارا ہے، اس لیے اپنی کمزوری سے کبھی ناامید نہ ہو (۱۰) ۔

اس عقیدے سے ایک وسیع انسانی برادری کی تشکیل ہوتی ہے جن میں سے ہر فرد دوسرے کے ساتھ اتحاد و مساوات کا احساس رکھتی ہو اور سب ایک نصب العین پر گام زن ہوں، سب اپنی خواہشوں کو مشترک اصول اور مقصد میں فنا کر دیں اور سب لپنے واحد حاکم کی رضامندی کے خلوت اور انجمن ہر حالت میں طلب گار رہیں اور کسی وقت قانون کے احترام کو ہاتھ سے نہ جانے دیں ۔ اس جماعت کے افراد میں خودداری ہو کہ وہ کسی مادی طاقت کے سامنے سر نہ جھکائیں، بلند حوصلگی ہو کہ کسی دشوار مقصد کو ناممکن سمجھیں اور اعتماد ہو جس سے کبھی لپنے دل میں یاس کا گزر نہ ہونے دیں ۔

دیکھیے تو یہی وہ عناصرِ ترقی ہیں جو بلند مرتبہ اقوام کے شایانِ شان ہیں ۔

عدل: یہ دراصل توحید ہی کا ایک شعبہ ہے ۔ خدا کی بلند و برتر ذات کے افعال کو کیسا ہونا چاہیے؟ جیسے اس کی ذات کامل، ویسے ہی اس کے افعال ۔ ان میں نقصان، فساد، خرابی اور برائی کا گزر نہیں ہو سکتا ۔ اس کا قانون، جو اس کے تمام کاموں میں جاری ہے، عدالت ہے (۱۱) ۔ یعنی ہر کام اس کا حکمت اور مصلحت کے موافق ہے، کسی کی حق تلفی، کسی پر ظلم (۱۲) اور کوئی کام عبث اور بے کار نہیں کرتا اس کی عدالت ہی بندوں سے بھی انصاف اور عدالت کی طالب ہے (۱۳) ۔ اس نے ہمیں ایک امانت دی ہے جس کا نام ہے اختیار ۔ ہمیں اس اختیار کو قانونِ عدالت کے مطابق صرف کرنا چاہیے ۔ عدل کا مقابل ہے ظلم ۔ ظالموں پر خدا نے لعنت کی

ہے (۱۴)، اس لیے کہ وہ خدا کے قانون کو توڑنے والے ہیں (۱۵)۔

اس عقیدے سے اس برادری میں جو انسانیت کے حدود میں قائم کی گئی ہے تبادلۂ حقوق اور انصاف و مساوات کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اس برادری کے افراد ایک دوسرے کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے (۱۶)، کیونکہ یہ ظلم ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک کو دوسرے پر اس دنیا میں فوقیت جو نظر آتی ہے، یہ بالکل وقتی اور عارضی ہے۔ خالق کی نگاہ میں سب یکساں ہیں اور وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے گا۔ گناہ اگر غریب کرے گا تو سزا ملے گی اور امیر کرے گا تو سزا پائے گا۔ وہاں اس کی دولت اور تونگری کچھ کام نہ آئے گی، نہ یہ رشوت دے کر اپنے بچاؤ کا سامان نکال سکے گا۔ اور اچھا کام اگر امیر کرے گا تو انعام پائے گا اور غریب کرے گا تو انعام پائے گا۔ اس کی غربت اس کی کسمپرسی کا باعث نہ ہوگی۔ اس طرح ہر شخص کو اپنے فرائض کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اپنے اعمال کی جانچ کی ضرورت پڑتی ہے۔ افراط اور تفریط، اسراف اور کنجوسی، سب ظلم ہیں اور ہر چیز میں وسط کا نقطہ عدالت کا مرکز ہے انسانی کمالات کی دنیا اسی اعتدال کے نقطے پر بستی ہے۔

خدا کو عادل سمجھنا اس اعتدال کی پابندی کا واحد محرک ہے اور اسی لیے جو اس اعتدال پر قائم رہیں، انھیں عادل کہا جاتا ہے اور سچے مسلمان وہی ہیں جو عدالت کی صفت سے ممتاز ہوں (۱۷)۔

نبوت: یہ تیسرا اصول ہے۔ حاکمِ مطلق، یعنی خدائے واحد کے احکام و قوانین کا رعایا تک پہنچانے والا، اس کے فرمانوں کا اجرا کرنے والا، اس کے پیغام کو پہنچانے والا رسول ہوتا ہے جو اپنے اخلاق اور سیرت میں ایک معیار اور اعلیٰ مثال ہوتا ہے (۱۸)۔ سب پر اس کی اطاعت لازم ہے، کیونکہ وہ عام خلائق میں خدائے احکم الحاکمین کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کے احکام خدا کے احکام ہوتے ہیں (۱۹)۔ کسی کو اس کے مقابلے میں رائے زنی، عقل آرائی اور طبع آزمائی کا حق نہیں ہے، نہ اس کے فیصلے

کے بعد کسی کو چون وچرا کا موقع (۲۰) ۔

طرف داری ، جاہ طلبی ، خود غرضی ، انانیت ، جبروت اور نفسانیت سے پیدا شدہ کشمکش ، جو جماعت کے افتراق کا باعث ہوتی ہے ، محو ہو جانا چاہیے اس اختیار و اقتدار کے نیچے جو رسول کو حاصل ہے،اور اسی خود مختارانہ اقتدار میں جماعت کی تنظیم وترتیب اور نظم و اجتماع کا راز مضمر ہے ۔

امامت: رسول کی زندگی دنیا میں محدود ہے ۔ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اگر عام رعایا کو ان کی رائے ، خواہش اور مرضی پر چھوڑ دیا جائے تو پھر وہی مطلق العنانی ، خود غرضی برسرِکار آجائے گی اور جذبات کی حکومت ہو جائے گی جس کا نتیجہ سوائے افتراق و انتشارات اور ابتری کے کچھ نہیں ہو سکتا ۔ جو نظم و شیرازہ رسول کی خود مختار آمریت سے قائم ہوا تھا ، وہ پریشان ہو جائے گا ، اگر ان کے بعد افراد اور جماعتوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور ان کے لیے کوئی واحد مرکز مقرر نہ کیا جائے ۔

عقیدۂ امامت اس جماعتی انتشار کا سدِباب ہے ۔وہ یہ تسلیم کراتا ہے کہ نبی کے بعد بھی خداوندی قانون پر دنیا کو چلانے کے لیے مرکز موجود ہے ۔ وہ مرکز ایک ایسا شخص ہے جو خود قانون پر عمل کا بہترین نمونہ ہے اور قانون کے جزئیات پر پورے طور سے مطلع تاکہ اس کی پیروی کر کے لوگ صحیح اصول سے ہٹنے نہ پائیں ۔ جماعت کا انتظام اور شیرازہ بندی ایسی ہستی کے وجود پر موقوف ہے ۔اس کی اطاعت رسول کی اطاعت کی طرح ضروری ہے (۲۱) ، کیونکہ جس طرح رسول خدا کا نمائندہ تھا اس طرح یہ اس رسول کا جانشین ہے ، وہی تمام امتِ اسلامیہ کے لیے مرکز بن سکتا ہے ۔اور اگر کسی وقت میں ، جیسا کہ آج کل ہے ، اس تک دسترس نہ ہو تو وہی اشخاص جو رسولؐ اور ائمہ کے تعلیمات کے حامل ہوں ، مرکزِ امت قرار پا سکتے ہیں ۔ ان کے ہدایات پر عمل کرنا ، جو کتاب و سنت کے ماتحت ہوں ، تمام مسلمانوں کا

فرض ہوگا اور جو نظام ان تعلیمات پر مبنی ہو، وہی اسلامی نظام سمجھا جاسکے گا۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام نے خلق کے لیے ایک مرکز کی ضرورت تسلیم کی ہے، مگر یہ مرکز مادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ روحانی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مرکز میں اصلی حکومت خدا کی ہے (۲۲) اور اس کی نمائندگی میں رسولؐ اور اس کے جانشین یا ان کے تعلیمات کے حامل افراد دنیا کے لیے مرکزِ اتباع ہیں۔ یہ وہ نظام نہیں ہے جس کی بنیاد قہرمانی طاقت پر ہو، بلکہ وہ نظام ہے جس کا اصلی دارالسلطنت دل ہے اور دلوں پر حکومت کر کے افعال و اعمال کو پابند بنایا جاتا ہے۔ اسلام میں سلطنت خدا کی ہے، دنیوی بادشاہت کوئی چیز نہیں ہے۔ بادشاہ کی اطاعت اپنی حفاظتِ جان و مال کے لیے ایک مجبورانہ فعل ہے (۲۳) جو امن و امان قائم رکھنے کے لیے وقتی حیثیت سے ضروری ہے، مگر اسے کوئی مستقل حیثیت اور حقانیت کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

اسلام کسی شہنشاہیت کی بنیاد قائم نہیں کرتا، بلکہ انسانیت کا نظام بناتا ہے اور ایک قوم کی تشکیل کرتا ہے جو انسانیت کا صحیح نمونہ ہو، اور اس نظامِ انسانیت کے لیے ایک محافظ قرار دیتا ہے جو ان تمام کامل انسانوں کا واحد مرکز ہو۔ یہ اپنے زمانے میں رسولؐ ہے اور رسول کے بعد اس کے نامزد کردہ جانشین یعنی امام، اور اگر امام براہِ راست رہنمائی سے مجبور ہوں تو ایسے افراد جو ان کی تعلیمات پر زیادہ سے زیادہ مطلع اور عامل ہوں۔

معاد: خدائے واحد کے مقرر کردہ نظام کی پابندی، اس کے نمائندۂ خصوصی، یعنی رسولؐ کے پیغام کی قبولیت اور ان کے جانشینوں کے احکام کی اطاعت کے لیے جزا و سزا کا نفاذ ضروری ہے۔ یہ خدا کی عدالت کا لازمی تقاضا ہے (۲۴) اور اسی سے طاعت گزار اور نافرمان اشخاص میں امتیاز قائم ہوتا ہے۔

مندرجۂ بالا بیان سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اصول دین ایک سلسلے کی کڑیاں ہیں جن میں سے ایک کڑی بھی نکال دی جائے تو نظام برہم ہوجائے گا اور تمام

اصول کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی حکومت کے آگے سرِ تسلیم خم کیا جائے ، اس کے مقابلے میں کسی کی اطاعت نہ کی جائے ، اس کے قانون کی پابندی ہو اور اس قانون کے جاری کرنے والے اور اس کی حفاظت کرنے والے اور اس کے قائم رکھنے والوں کی اطاعت کی جائے ۔ اس قانون پر عمل کے لیے جزا اور اس قانون کو توڑنے کے لیے سزا مقرر ہے جس کا نام معاد ہے ۔

فروعِ دین

قانونِ الہیٰ کے تحت کچھ احکام جاری کیے گئے ہیں اور فرائض قرار دیے گئے ہیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ترقی کے لیے ضروری ہیں ، ان کا نام فروعِ دین ہے ۔ ان پر عمل کرنا ایک سچے مسلمان کی نشانی ہے اور بغیر ان پر عمل کے اسلام کا مقصد حاصل نہیں ہوتا ۔

(۱)	نماز	انفرادی تکمیل کے لیے
(۲)	روزہ	ایضاً
(۳)	حج	اجتماعی زندگی کی تکمیل کے لیے
(۴)	زکاۃ	ایضاً
(۵)	خمس	ایضاً
(۶)	جہاد	ایضاً
(۷)	امر بالمعروف و نہی عن المنکر	ایضاً

نماز : حاکمِ اصل ، یعنی مرکزِ احدیت کے ساتھ ارتباط کا احساس پیدا کرنے والی ، اس کے دربار میں ہر روز حاضری کا تخیل قائم کرنے والی اور اس کے ساتھ اپنے رشتۂ عبودیت کی برابر یاد دلانے والی ہے ۔

اس کا اصل جوہر ہے اپنے گرد و پیش کی ہر چیز کو بھول کر اپنے خدا کی طرف

خالص توجہ کا حاصل کرنا، مادی ماحول کو عبور کر کے مرکزِ حقیقت پر نگاہ کو قائم رکھنا۔ بار بار کی ریاضت سے اگر یہی چیز دماغ میں راسخ ہو گئی تو انسان اپنے تمام فرائض کا احساس رکھے گا اور کوئی ایک بھی اخلاقی یا اجتماعی جرم اس سے صادر نہیں ہو سکتا (۲۵)۔

روزہ: ضبطِ نفس کی عملی مشق، خواہشوں سے مقابلے کی ورزش اور جہادِ نفس کی تیاری کا میدان ہے۔ قانون کی خلاف ورزیاں تمام انسانی جذبات اور خواہشوں سے ہوتی ہیں اگر جذبات پر قابو حاصل ہوجائے تو انسان فرائض کو نظر انداز نہ کرے۔ روزہ ان ہی جذبات کے مغلوب کرنے کا عملی ذریعہ ہے، اسی سے تقویٰ کی صفت پیدا ہوتی ہے (۲۶) جس کا دوسرا نام ہے احساسِ فرائض۔ سب سے زیادہ کامل انسان وہی ہے جو سب سے زیادہ فرض شناس ہو (۲۷)۔

حج: فرض کے احساس میں وطنی زندگی، راحت اور آرام اور اس کے ساتھ ساتھ مال کی قربانی کرنا ہے، مختلف ممالک کے قومی اور وطنی امتیازات کو بھلا کر سب کے ایک نقطے پر مجتمع ہونے کا مظاہرہ ہے (۲۸) اور یہ بتلانا ہے کہ مشترک مقصد کے حاصل کرنے میں آپس کے نسلی اور وطنی امتیازات سدِ راہ نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی وسیع برادری میں میل جول پیدا کر کے ان کو اجتماعی زندگی کے فوائد سے روشناس بنانا ہے اور ان کو ایک جگہ جمع کر کے جماعتی مفاد کے تدابیر سوچنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع دینا ہے۔

زکاۃ و خمس: دولت مند طبقے میں ایثار و ہمدردی کا احساس پیدا کرنا، اسلامی جماعت کے محتاج افراد کی احتیاج کو دور کر کے جماعت کو مضبوط بنانا اور مخصوص سرمائے سے مشترک مقاصد کے حصول کا سامان مہیا کرنا۔

جہاد: انفرادی زندگی کو اجتماعی زندگی کے مفاد پر قربان کر دینا اور بیرونی خطرات سے جماعت کو محفوظ رکھنا۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر: خداوندی حکومت کا رضاکارانہ فرض، خلق خدا کی بہبودی اور مفادِ عامہ کی حفاظت اور قانونِ خداوندی کے احترام کو قائم رکھنے میں ہر مسلمان کو ایک سپاہی کی حیثیت سے حصہ لینا اور ہمدردی کے ساتھ ہر غلط راستہ چلنے والے کو ٹھیک راستے پر لانے کی کوشش کرنا (۲۹)۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فروعِ دین بھی ایک سلسلے کی کڑیاں ہیں جن کا مقصد ہے عادل مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت کا قائم کرنا جو فرائض کا احساس رکھنے کے ساتھ بیرونی خطرات سے محفوظ ہوں اور جن کا ہر فرد محتاجی سے آزاد ہو کر پوری توجہ سے مفادِ عام میں کوشاں ہو اور شخصی مفاد کو اجتماعی مصلحت پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو۔

اصول و فروع کا مجموعی خلاصہ

اب آپ ایک نظر سے اگر اصول اور فروع، دونوں کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کا مقصد ہے ایک ایسی قوم کا پیدا کرنا جو خدا کی بادشاہت کو تسلیم کرے، اس کے مقرر کردہ حاکم (رسول) اور اس کے نائبین (اولو الامر، یعنی ائمہ) کے احکام پر وفاداری کے ساتھ عمل کرے۔ تشتت و افتراق اور باہمی اختلافات سے بچتے ہوئے سب اسی ایک رشتے میں منسلک ہوں، فرائض کا احساس رکھیں، کسی دنیاوی طاقت سے مرعوب نہ ہوں، نہ کسی لالچ کے فریب میں مبتلا ہوں.... اپنے مالک کی طاقت پر بھروسا رکھیں، کبھی ہمت نہ ہاریں، نہ کبھی ناامید ہوں.... آپس میں اتحاد و مساوات کا خیال کریں، قانونِ عدالت کے پابند رہیں، باہمی حقوق کا لحاظ رکھیں اور اپنے تمام افعال میں افراط و تفریط سے بچتے ہوئے نقطۂ اعتدال پر قائم رہنے کی کوشش کریں....

خدا اور رسولؐ کے احکام کے سامنے اپنے اختیاراتِ خصوصی اور حقوقِ امتیازی کا دعویٰ نہ کریں، اپنی مرضی کو قانون کے ماتحت رکھیں اور احکامِ رسولؐ کا تابع قرار دیں.... اپنے مرکز سے کبھی منحرف نہ ہوں اور خودسری و سرکشی کے مرتکب نہ ہوں.... دنیا کی وقتی کامیابی و ناکامی کے آگے ایک آخری انجام کا یقین رکھیں اور اپنے اعمال و فرائض میں آخرت کو ہمیشہ مدِ نظر رکھیں.... قانون کی پابندی کو فرض سمجھیں اور اپنی ذاتی خواہشوں اور نفسانی تقاضوں کو اپنے قابو میں رکھیں.... اچھے افعال کے پابند ہوں اور برے افعال سے کنارہ کشی کریں.... فرائض کی بجاآوری میں جسمانی مشقت اور مالی قربانی کو برداشت کرسکیں اور ضرورت ہو تو جان تک دینا گوارا کرلیں.... آپس میں اجتماعی رشتے کو مضبوط و مستحکم رکھیں اور کمزور افراد کو اپنے سرمائے اور طاقت سے فائدہ پہنچا کر مشترک مقصد کو قوت پہنچائیں۔

یہ جماعت اپنی فرض شناسی، ایثار اور تنظیم کی وجہ سے ایسی طاقت ور ہو کہ بیرونی حملوں کا خطرہ نہ پیدا ہو۔ اور ان میں سے ہر فرد بلا کسی خارجی رکاوٹ کے اپنی داخلی اصلاح اور قومی تربیت اور ناواقف افراد کی رہ نمائی اور ناقص اجزا کی تکمیل میں ہمہ تن سرگرم ہو۔

یہ ہوں گے حقیقی مسلمان۔ اور جس دنیا میں ایسے آدمی بس جائیں، وہ ہوگا واقعی "دارالاسلام"۔

کیا رسولؐ کے بعد ظاہری مسلمانوں نے کبھی اس پر غور کیا؟ اور ہوسِ ملک گیری کے پیچھے اس طرح کی جماعت کی تشکیل کی بھی کوشش ہوئی؟ اسی کا نتیجہ تھا کہ فانتم الاعلون کا وعدہ ختم ہوگیا اور "مسلمان" دنیا میں محکوم ہوگئے۔ کاش اب بھی آنکھیں کھلیں اور سمجھیں کہ ہماری تمام ترقیاں "مسلمان" بننے میں مضمر ہیں۔

مردم شماری میں اضافے سے کوئی حاصل نہ ہوگا جب تک مسلمانوں میں "حقیقتِ اسلام" کا جوہر پیدا نہ ہوگا اور "پاکستان" کی خیالی دنیا مفتوح ہوجائے گی؛

جبکہ اس میں وہ مسلمان نہ ہوں گے جو اپنے اوصاف سے دنیا بھر کو فتح کر سکتے ہوں۔

نوٹ:

۱).... الھکم الہ واحد

۲).... ما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ

۳).... لو اتبع الحق اھواء ھم نفسدت السموت والارض

۴).... عالم الغیب والشھادۃ

۵).... ان اللّٰہ بکل شیئی علیم

۶).... یستحفون من الناس ولا یستحفون من اللّٰہ وھو معھم اذ یبیتون مالا یرضیٰ من القول وکان اللہ بما یعلمون محیطا

۷).... یخشون الناس واللّٰہ احق ان یخشوہ ان کنتم مومنین

۸).... ھو القاھر فوق عبادہ

۹).... ان اللّٰہ علی کل شیئی قدیر

۱۰).... لا تیئس من روح اللّٰہ انہ لا تیئس من روح اللّٰہ الا القوم الکافرون

۱۱).... تمت کلمۃ ربک صدقا وعدلا لا مبدل لکماتہ

۱۲).... ان اللّٰہ لیس بظلام للعبید

۱۳).... ان اللّٰہ یامر بالعدل والاحسان

۱۴).... الا لعنۃ اللّٰہ علی القوم الظالمین

۱۵).... ومن یتعدد حدود اللّٰہ فاولئک ھم الظالمون

۱۶).... لا یسخر قوم من قوم عسے ان یکونوا خیر امنھم

۱۷).... وکذلک جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علے الناس

۱۸).... قد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ

۱۹).... ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھا کم عنہ فانتھوا

۲۰).... و ما کان لمؤمن و لا مؤمنة اذا قضی و رسوله امر ا ان یکون لهم الخیرة من امرهم

۲۱).... اطیعو اللّٰہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم

۲۲).... ان الارض للّٰہ

۲۳).... الا من اکره و قلبه مطمئن بالایمان

۲۴).... یوم نضع الموازین القسط لیوم القیامة

۲۵).... ان الصلوٰة تنہیٰ عن الفحشآء و المنکر

۲۶).... کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون

۲۷).... ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم

۲۸).... جعلنا البیت مثابة للناس

۲۹).... و لتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینهون عن المنکر و اولئک هم المفلحون

حضرتِ علیؑ کی شخصیت

علم اور اعتقاد کی منزل میں

حجۃ الاسلام سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ

ایک چیز ہے علم، اس کا تعلق ان اوصاف سے ہوتا ہے جو کسی شخص میں پائے جاتے ہیں جیسے ایک حسین و جمیل شخص کا حسن و جمال ایک شجاع کے بہادرانہ کارنامے، ایک سخی کی فیاضی اور ایک عالم کے علمی فتوحات وغیرہ یا ان کے مقابل اوصاف اور نقائص، اور ایک دوسری چیز ہے اعتقاد۔ یہ ان مراتب اور مناصب سے متعلق ہوتا ہے جو کسی شخص کے لیے سمجھے اور مانے جاتے ہیں۔

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص کے بارے میں اگر رائے اور اعتقاد میں اختلاف ہے تو اس کے صفات بھی معرضِ بحث بن جاتے ہیں اور اس کے اوصاف کو ایک علم و یقین کے انداز میں بیان کرتا ہے اور دوسرے نہ یہ کہ لاعلمی ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان کا انکار کرتے اور ان کے خلاف علم کا ادعا رکھتے ہیں۔ مختلف فیہ شخصیتوں کے بارے میں اس کا ہر شخص ذاتی طور پر مشاہدہ کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک طرف ان کے علم کے تذکرے سنائے جا رہے ہیں اور دوسرے ان کو جاہلِ محض قرار دیتے ہیں۔ ایک گروہ شجاعت کا حال بیان کرتا ہے اور دوسری جماعت بزدلی کے نمونے پیش کرتی ہے، ایک فیاضی کی داستانیں دہرا رہا ہے اور دوسرے ان کے بخل کے شاکی ہیں، ایک عدالت کی مثالیں گنوا رہا ہے اور دوسرے مظالم کی فہرست سنا رہے ہیں.... مگر ایسی بہت ہی غیر معمولی شخصیتیں ہو سکتی ہیں جن کے متعلق اعتقاد کی منزل میں اختلاف کے باوجود اوصاف کی منزل میں دنیا متفق نظر آتی ہو۔ ایسی سب سے پہلی مثالی شخصیت ہمیں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

ملتی ہے۔ آپؐ کے بارے میں اعتقاد کے لحاظ سے اختلاف کا ہونا تو اس سے ظاہر ہے کہ دنیا دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، ایک مومن اور دوسرے کافر۔ اور یہ "کافر" کی لفظ کا جو اسلام نے ان کے لیے محاورہ قائم کر دیا ہے، یہ نہ کوئی گالی ہے اور نہ کوئی طنز، بلکہ یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے جسے وہ خود تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ کسی بھی بات کو لیجیے، ایک مانتا ہے اور ایک نہیں مانتا۔ تو جو مانتا ہے، وہ اس کی نسبت سے مومن ہے اور جو نہیں مانتا، وہ اس کی بہ نسبت کافر ہے، چنانچہ قرآنِ مجید میں ایمان کے ساتھ ساتھ کفر کو بھی متعلق کے اختلاف کے ساتھ اوصافِ مدح میں وارد کیا ہے اس طرح کہ:

فمن یکفر بالطاغوت و یؤمن باللّٰہ فقد استمسک
بالعروۃ الوثقیٰ

جو طاغوت، یعنی باطل کی طاقت سے کافر ہوا اور اللہ کے
ساتھ مومن ہوا، اس نے اللہ کی رسی کو، جو مضبوط ہے،
تھام لیا ہے۔

دوسری جگہ اہلِ ایمان کی زبانی مقابل جماعتوں کو مخاطب کر کے یہ اعلان ہے کہ کفرنا بکم: "ہم تمھاری باتوں کی بہ نسبت کافر ہیں"۔ بس اسی لفظ کو اسلام کی مقابل جماعتوں کے لیے صرف کیا گیا جس کے معنی کے لحاظ سے اگر خود ان سے پوچھا جائے تو وہ اس کہنے کے لیے تیار ہوں گے کہ ہم اس پیغام کو نہیں مانتے یا ان کی رسالت تسلیم نہیں کرتے۔ بس لغوی طور پر یہی نہ ماننا کفر ہے اور یہی کافر کی لفظ قرآن نے ان کے لیے صرف کی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جب پیغمبرؐ کے بارے میں اعتقاد کی منزل آئی تو اس وقت بھی دو گروہ تھے اور اب بھی دو گروہ ہیں، ایک ماننے والے اور دوسرے نہ ماننے والے یعنی مومن اور کافر، مگر یہ تفریق اعتقاد کی منزل میں ہوئی۔ لیکن آپ کے اوصافِ ذات کی منزل جس سے علم کا تعلق ہے، اس میں یہ تفریق قطعاً نہیں ہوئی، اس لیے جو کافر ہوئے، وہ بھی آپ کو صادق جانتے تھے اور امین کی

حیثیت سے مانتے تھے ۔ اس صادق اور امین کے جاننے میں رسالت کا ماننا اور نہ ماننا کوئی فرق پیدا نہ کر سکا، یہاں تک کہ امین اس وقت بھی جانتے تھے جبکہ آپ کی جان لینے کے درپے تھے اور اگر امین جانتے نہ ہوتے تو شبِ ہجرت تک ان کی امانتیں رسولؐ کے پاس کیوں رہتیں ؟

بس یہی صورت ہمیں رسولؐ کے بعد کی اسلامی شخصیتوں میں بدرجۂ اتم ان ہی کے آغوش پروردہ حضرتِ علی ابن ابی طالب میں نظر آتی ہے ۔

آپ کے بارے میں جب اعتقاد کی منزل پر نظر ڈالتے ہیں تو اتنا عظیم اختلاف نظر آتا ہے جتنا کسی شخصیت کے بارے میں ملنا مشکل ہے ، یعنی ایک طرف افراط کی حد ہے جہاں غلو کی منزل الوہیت کے اعتقاد تک پہنچی ہوئی ہے اور دوسری طرف تفریط کی وہ رفتار ہے جو خوارج کے عقیدے کی شکل میں موجود ہے ، اور پھر درمیان میں افراط و تفریط کے مختلف مدراج ہیں جن میں وہ ایک نقطۂ اعتدال ہے جو حقیقتِ امر کے مطابق ہے اور بنصِ رسولؐ معیارِ فلاح و نجات ہے ۔ یہ تو ہے اعتقاد کا عالم ، مگر جب آپ کے بارے میں علم کی منزل آتی ہے یعنی آپ کے اوصاف کی بلندی تو اس میں ہمیں قطعاً کوئی اختلاف نظر نہیں آتا ۔

کوئی آپ کو امام اور خلیفۂ بلا فصل مانے ، کوئی آپ کو سید الاولیا مانے اور سلسلۂ بیعت و ارادت کی آخری کڑی تسلیم کرے ، کوئی سلسلے کا چوتھا خلیفتہ المسلمین مانے یا کوئی آخر میں جا کر کچھ نہ مانے بلکہ معاذ اللہ ! آپ سے برأت کو اپنے دین کا جزو بنالے .... مگر یہ سب ہی مانتے ہیں کہ آپ سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا ، آپ سے بڑھ کر کوئی شجاع و بہادر نہ تھا ، آپ سے بڑھ کر کوئی عابد و زاہد نہ تھا .... غرض انسانی صفاتِ کمال کا بے مثال مرقع ہونے میں کوئی انکار کیسا ، شک و شبہ بھی نہیں کرتا ، اس لیے خود آپ کے دور میں سلمان ، ابوذر ، مقداد اور عمار یاسر جو کہہ رہے ہیں ، وہ تو کہہ ہی رہے ہیں ، دوسری طرف خلیفۂ اول بھی حدیثِ رسولؐ سنا رہے ہیں کہ النظر الی وجہ علی عبادۃ اور خلیفۂ دوم بھی اعتراف کر رہے ہیں کہ لو لا

علی لھلک عمر ، اور ام المومنین عائشہؓ بھی فرما رہی ہیں کہ حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طبقۂ خواتین میں سب سے زیادہ محبت اپنی بیٹی فاطمہ زہراؑ سے تھی اور مردوں میں سب سے زیادہ محبت ان کے شوہر علی ابن ابی طالبؑ سے تھی اور یہاں تک کہ امیرِ شام معاویہ نے بھی ضرار کی زبان سے حضرتِ علی ابنِ ابی طالبؑ کے اوصاف و محامد کا تذکرہ سن کر اپنے دربار میں اعتراف کیا کہ

رحم اللہ اباالحسن فقد کان کما وصفت: " بے شک ابوالحسن (حضرتِ علیؑ) ایسے ہی تھے جیسا تم نے بیان کیا"۔

یہ ہے اوصاف کی وہ عظمت جہاں دوست و دشمن اور مومن و کافر کی کوئی تفریق نہیں رہی اور اعتقاد کی منزل میں کتنا ہی اختلاف ہو، لیکن اس شخصیت کے بارے میں علم کی منزل میں سب یکساں نظر آتے ہیں۔

اسلامی نظریۂ حکومت

حجۃ الاسلام سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ علیٰ سید الانبیاء

والمرسلین و الہ الطاہرین

تمہید

حکومت کی ضرورت

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ نوعِ انسان کے لیے حکومت کا وجود ضروری بھی ہے یا نہیں۔ اگر مطلق العنان کا تخیل انسان کے لیے صحیح ہے تو یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ حکومت کی مطلق ضرورت ہی نہیں، مگر انسان کا آزادیٔ مطلق سے دوچار ہونا غیر ممکن ہے۔ یہ کہنا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور آزادی اس کا فطری حق ہے، بالکل بے معنی الفاظ کا مجموعہ ہے، جب تک اس کے ساتھ یہ قید نہ لگائی جائے کہ "ناجائز قیود سے آزادی"۔

اگر انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے تو اس کے لیے اجتماعی قیود کی پابندیاں ناگزیر ہیں، حالانکہ حیوانات میں بھی بعض میں اجتماعی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں مگر انسان کو تو اس سے مفر ہی نہیں۔ ان ہی اجتماعی قیود کا نام "دستور العمل اور قانون" ہے اور اسی کی نافذ کرنے والی طاقت کا نام حکومت ہے۔

ممکن ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ اگر افراد خود احساس فرض رکھتے ہوں تو ان کے لیے حکومت کی ضرورت نہ ہوگی، مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے لیے صرف احساس فرض کافی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو صحیح نظام کی معرفت بھی ضروری ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ ان سب کا نقطۂ نظر مفادِ اجتماعی میں ایک ہی نقطے تک پہنچے اور کوئی دانستہ یا نادانستہ دوسرے کے مفاد کو نقصان نہ پہنچائے، اور یہ اسی وقت ہوسکے گا جب وہ پوری جماعت فکر و ارادہ و عمل، تمام منزلوں میں یکساں درجے پر غلطی سے بری یعنی معصوم ہو۔ ایک ایسی جماعت کا ایک جگہ پر فراہم ہونا خیالی دنیا میں ممکن ہے وجود رکھتا ہو مگر خارجی عالم میں وقوع سے بے گانہ ہے، اس لیے اس صورت پر بحث ہی کرنا بے کار ہے۔ جہاں تک کہ عام انسانوں کا تعلق ہے، کوئی بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا نظامِ اجتماعی، یہاں تک کہ ایک گھر کی آبادی جو معاشرتی زندگی کی سب سے پہلی منزل ہے، یہ بھی کچھ حدود و حقوق اور ان کی پابندی کے بغیر باقی نہیں رہ سکتی اور اس میں بھی ایک طاقت کی ضرورت ہے جو سب کو ان حدود کا پابند بنائے، اسے آپ حاکم نہ کہیے، گھر کا بڑا کہہ لیجیے۔ مگر یہی چیز ایک بڑے دائرے میں پہنچ کر حکومت کہلاتی ہے جس کی نوعیت میں چاہے جتنا بھی اختلاف کیا جائے، مگر اس کی ضرورت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اقسامِ حکومت

ارسطو نے حکومت کی تین قسمیں قرار دی ہیں:

۱) ایک شخص کی حکومت

۲) تھوڑے محدود و معین افراد کی حکومت

۳) بہت سے افراد کی حکومت

اور یہ واقعہ ہے کہ اس وقت سے اب تک دو ہزار برس گزرنے کے باوجود دنیا طرح طرح کے تمدنی انقلابات کی تبدیلیوں کے باوجود ان تینوں قسموں کے دائرے

سے باہر نہیں نکلی ہے ، مگر جب ہم ان تینوں صورتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو کوئی بھی ان میں سے عقلی اصول پر درست ثابت نہیں ہوتی ۔

ا) ایک شخص کی حکومت: اس میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ایک شخص میں آخر امتیاز کون سا ہے کہ وہ حاکم ہو جائے اور باقی سب انسان اس کے محکوم ہوں ۔ اس کے لیے قدیم زمانے میں سلاطین کی جانب سے یہ خیال پھیلایا گیا کہ حاکم پیدائشی طور پر دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے ۔یوں سمجھنا چاہیے کہ جیسے انسان حیوانوں میں ایک نوع ممتاز ہے ، ویسے سلاطین کا طبقہ انسانوں میں فطری طور پر ایک نوع ممتاز ہوتا ہے مگر یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے ۔ان انقلابات کو دیکھنے کے بعد جن میں سلاطین معزول ہو گئے ہیں اور کبھی کبھی آخر میں مقید رہے ہیں بلکہ گدائی پر مجبور ہو گئے ہیں ، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک غیر معمولی انسان ہونے کا تصور صرف اس تخیل عظمت کی پیداوار ہوتا ہے جو عوام کے دماغ و دل پر ان کی سلطنت کے دور میں مستولی ہوتی ہے اور اسی لیے جب وہ تخیل ختم ہو جاتا ہے تو وہ بالکل معمولی انسان معلوم ہونے لگتے ہیں اگر ان کا امتیاز کوئی پیدائشی حق ہوتا تو وہ کبھی سلب نہ ہوتا ، نہ اس میں انقلاب ہوتا پھر جب ہم تاریخ کا تبصرہ مختلف سلاطین پر دیکھتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر بہت سے اوصاف میں عام انسانوں سے بھی پست تھے۔چونکہ مورخ کا قلم اکثر اس تخیل سے خالی ہوتا ہے جو رعایا کے دل میں بادشاہ کی نسبت ہوتا ہے ، اس لیے وہ صاف لکھ دیتا ہے کہ فلاں بادشاہ احمق تھا یا جاہل تھا ، یا بے رحم تھا یا خود غرض تھا وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا سبب جو ایک شخص کے اقتدار کے جواز کا بتایا گیا ہے ، وہ طاقت و اقتدار ہے ۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں قہر و غلبہ کہا جا سکتا ہے ۔ ہمیں قہر و غلبہ کا ذریعۂ حکومت ہونا تسلیم ہے مگر معیارِ حقانیت ہونا کسی طرح تسلیم نہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے حکومت قائم ہو جاتی ہے ، بالکل ٹھیک ! مگر قائم ہونا چاہیے بھی ، ایسا نہیں ہے ۔بہت سی باتیں ہو جایا کرتی ہیں ، مگر ان کا ہو جانا صحت و جواز کا ثبوت نہیں

ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایک گھر کا دروازہ کھلا رہ گیا اور گھر والے بے خبر سو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ضرور ہے کہ چور آئیں اور سب مال لے جائیں، مگر ان کا یہ مال و اسباب لے جانا جائز بھی ہو، یعنی وہ مجرم قرار نہ پائیں، ایسا نہیں۔ اسی طرح اگر ڈاکو مسلح ہو کر حملہ کریں اور گھر کے رہنے والے یا تو اسلحہ رکھتے نہ ہوں یا تعداد میں کم ہوں تو کوئی شک نہیں کہ وہ ڈاکو جبر و طاقت سے ان کے مکان یا اسباب پر قبضہ کر لیں گے، مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مال و اسباب یا جائداد ان کی ملک بھی ہو جائے، بلکہ دنیا کا ہر قانون ان ڈاکوؤں کو سزا دینے اور ان سے اس مال کے برآمد کرنے کے لیے تیار ہوگا۔ پھر اگر ایک مکان پر قہر و غلبہ ملکیت قائم نہیں کر سکتا تو ایک ملک یا قوم پر یہ قہر و غلبہ تسلط کو جائز کیونکر قرار دے سکتا ہے؟ پھر اگر طاقت ہی سے کسی فرد نے حکومت قائم کی تو اگر رعایا طاقت حاصل کر کے اس کی مخالفت کرے تو اسے کیونکر جرم سمجھا جا سکتا ہے؟

اب اس کے بعد ایک انسان کے اقتدار اور حکومت کے لیے دوسرے انسانوں پر کوئی وجہِ جواز باقی نہیں رہتی۔

۲) تھوڑے محدود و معین افراد کی حکومت: اس کے بارے میں بھی وہی سوال ہے، یعنی ان چند آدمیوں کو حقِ حکومت کیونکر حاصل ہوا اور جس طرح ایک شخص کی حکومت کے لیے کوئی دلیل نہیں مل سکتی، اس طرح یہ چند آدمیوں کی حکومت بھی بلاوجہ ہے۔

۳) بہت سے افراد کی حکومت: اس کے بارے میں سوال یہ ہے کہ یہ بہت سے آدمی تمام قوم کا جزو ہیں یا کل قوم ہیں۔ اگر جزو ہیں تو پھر وہی بات بحث طلب ہے کہ ان بہت سے آدمیوں کو مابقی افراد پر حکومت کا حق کیا ہے اور اگر یہ کل قوم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خود پوری قوم حاکم ہے اور خود ہی محکوم۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مفادِ حکومت ختم.... حکومت کی ضرورت تو اس لیے تھی کہ ان افراد میں جو خود غرض، مطلب پرست اور کوتاہ نظر ہیں، کوئی طاقت ایسی ہو جو سب کو صحیح قانون کا پابند

بنائے ۔ لیکن جب قانون سازی خود اس جماعت کا کام ہو گیا تو یہ اپنے مطلب کے مطابق جیسا، جس وقت چاہے گی، ویسا قانون بنائے گی، چاہے وہ صحیح ہو، چاہے غلط ۔ اور اس کے نتیجے میں مختلف جماعتوں اور مختلف افراد میں رسا کشی ہوتی رہے گی، یعنی ہر ایک چاہے گا کہ اپنے مطلب کی باتوں کو تمام جامعہ کے سر منڈھ دے اور اس کو ہر ایسے موقع پر بدل دینے کی کوشش کرے جبکہ اس کے مقصد کو نقصان پہنچاتا ہو ۔ پھر اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ تمام جماعت کسی ایک یا چند افراد کو دستور سازی کے لیے خود مقرر کرے تو جبکہ وہ افراد ان ہی عوام کے منتخب کیے ہوئے ہیں تو ان ہی عوام کی مرضی پر چلنا ضروری ہوگا، یعنی انھیں یہ لحاظ نہ ہوگا کہ صحیح و مناسب کیا ہے، بلکہ یہ دیکھیں گے کہ عام افراد چاہتے کیا ہیں اور اگر کبھی بھی انھوں نے رائے عامہ کی مخالفت کی تو یہ دوسری بار کے انتخاب میں ان کے ہاتھ سے اختیارات لے لیے جائیں گے اور دوسروں کے سپرد کیے جائیں گے ۔

پھر ایک بحث یہ بھی ہے کہ رائے عامہ کے معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے ۔ ووٹ یعنی انتخابی رائیں، مگر یاد رہے کہ عوام اپنے شعور سے کام لینے کی صلاحیت نہیں رکھتے ۔ وہ بے سوچے سمجھے خواص کے ہاتھ میں ہو جاتے ہیں اور جو خواص چاہتے ہیں، وہ ان سے کرا لیتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہے کہ جسے سمجھا جاتا ہے اکثریت کا فیصلہ، وہ حقیقت میں چند افراد کی رائے ہوتی ہے جسے وہ مختلف صورتوں سے افرادِ قوم پر مسلط کرتے ہیں اور ان کے احساسات کو بے ہوشی سنگھا دیتے ہیں یہ سمجھا کر کہ یہ آپ کی رائے سے ہو رہا ہے ۔ اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوری انتخابات میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ۔ ایک وقت میں وہی شخص اکثریت کا قبلۂ عقیدت ہوتا ہے اور دوسرے وقت وہی مخذول و منکوب ہو جاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص اپنے خصوصیات و اوصاف کے اعتبار سے بدلتا نہیں ہے مگر عوام کے رجحانات بدلتے ہیں اور اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عوام کا رجحان بھی صحت کا ذمے دار نہیں ہے ۔

حقیقتِ امر یہ ہے کہ جمہوری نظام سے حاصل شدہ اقتدار بھی ایک شخص یا چند

اشخاص کو ایک طرح کے قہر وغلبہ ہی سے حاصل ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ کوئی غلبہ فولادی ہتھیاروں سے حاصل کیا جاتا ہے اور کوئی غلبہ ایسے ہتھیاروں سے جو دماغ کو متاثر کردیں۔ کوئی شکنجہ ایسا ہو جس سے جسم کے مقید ہونے کا اندیشہ ہو اور کوئی شکنجہ ایسا ہو جو آزادی خیالات کو محصور کردے، نتیجہ دونوں کا ایک ہے اور صحت و حقیقت سے دونوں دور ہیں۔

معاہدۂ عمرانی اور اس پر بحث

ایک نظریہ جسے "معاہدۂ عمرانی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کہ تمام قوم کی حکومت تمام قوم پر ہے، اس طرح کہ فرد اپنے اختیار سے اپنی ذاتی آزادی اور مطلق العنانی کو قربان کردے مفادِ اجتماعی کی خاطر، اس طرح یہ پابندی اس کے لیے بارِ خاطر نہ ہوگی، کیونکہ وہ خود اپنے ہاتھ سے بخوشی اپنے ہی اجتماعی مفاد کے لیے اختیار کی گئی ہے۔ مگر اس میں سوال یہ ہے کہ جس طرح ابتدا میں یہ معاہدہ دل کی خوشی ہے اور اسی لیے وہ حقِ آزادی کے خلاف نہیں، اسی طرح کیا بعد میں اس معاہدے پر باقی رہنا امرِ اختیاری ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس قانون کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی یا مخالفت جرم نہ ہو جبکہ وہ شخص جس نے معاہدہ کیا تھا، خود ہی اس معاہدے کو شکستہ کر دینا چاہتا ہے۔ اور اگر خلاف ورزی جرم ہے اور اس کے بعد معاہدے پر برقرار رہنا ضروری ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آزادی افراد کی ہمیشہ کے لیے سلب ہوگئی، حالانکہ اس نظریے کی بنیاد بقائے آزادی پر ہے۔

پھر یہ کہ جب افرادِ جامعہ خود غرض اور مطلب پرست ہوں تو انھیں اس کا پابند کیسے کیا جاسکتا ہے کہ وہ قانون کی تشکیل میں اپنے مفادِ شخصی کو پیشِ نظر نہ رکھیں اور صرف مفادِ اجتماعی پر نظر ڈالیں۔ اس کی کوئی ضمانت نہیں ہو سکتی اور بغیر اس کے جو قانون بنے، وہ مفادِ عمومی کا پورے طور پر نگہبان نہیں ہو سکتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اب تک دنیا نے جتنی بھی حکومت کی شکلیں تجویز کیں، ان

میں سے کوئی بھی مستحکم بنیاد پر قائم نہیں ہے۔

اسلامی حکومتیں

اب اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ پھر آخر اسلام کا نظریۂ حکومت کیا ہے ؟ یہاں بعض اوقات یہ دھوکا ہوتا ہے کہ اسلام کا نظریۂ حکومت ، یعنی مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں ، ان کا نظام ، مگر ایسا نہیں ہے ۔ یہ دونوں بالکل الگ چیزیں ہیں ۔ مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں ، ان کے متعلق بالکل غلط طور پر یہ مشہور ہے کہ وہ جمہوری اصول پر تھیں ، مگر یہ بالکل غلط ہے ۔ ان تمام حکومتوں میں شخصی فرماں روائی تھی جس کا اصول بھی ایک نہ تھا ، بلکہ ایک جلسے میں حاکم کا انتخاب ہوا اور کبھی سابق کے حاکم نے اپنے بعد والے کو نامزد کر دیا اور کبھی اس نے ایک کمیٹی مشورے کے لیے بنا دی اور کبھی ابھر کر صرف اقتدار قائم کرنا رہ گیا ۔ جیسا ہوتا گیا ، ویسے اصول بنتے گئے ، یعنی اجماع ، استخلاف ، شوریٰ ، قہر و غلبہ ۔

اب مختصر طور پر ان چاروں اصولوں پر تبصرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔

اجماع : اس سے مراد تمام رقبۂ مملکت کے افراد کا اتفاق سے یا صرف دارالسلطنت کے کل افراد کا اتفاق یا وہاں کی بھی ایک جماعت کا جو کسی خاص جگہ جمع ہو گئی ہو یا ان میں سے بھی بعض افراد کا جو متفق ہو گئے ہوں ۔ اگر کل افرادِ حدودِ مملکت مراد ہیں تو ظاہر ہے کہ ان تمام افراد کی رائے کا معلوم ہونا اس زمانۂ برق و بخار میں ، زمانۂ سیارہ و طیارہ میں بھی مہینوں کا کام ہے ۔ چہ جائیکہ اس زمانے میں جبکہ یہ وسائلِ مخابرت نہ تھے ، اس وقت میں یہ بات برسوں میں بھی حاصل ہونا مشکل تھی چہ جائیکہ اس سے کم ، یعنی ایک دن کا تھوڑا سا حصہ ۔ پھر عقلی طور پر وہ کتنے ہی کثیر افراد ہوں ، ان میں سے سب کے فیصلے کا درست ہونا بھی ان پر موقوف ہے کہ اس میں کوئی ایک غیر جائز الخطا ، یعنی معصوم مانا جائے اور اگر ایسا نہیں ہوا تو جس کل کا ہر جزو غلطی

کی آماجگاہ ہو، وہ کل غلطی سے بری کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ اور اگر صرف دار السلطنت کے کل افراد تو انھیں حق کیا ہے کہ وہ مابقی اطرافِ مملکت کے افراد کی آزادی کو سلب کر کے کسی حکومت کو ان پر مسلط کر دیں اس طرح کہ انھیں چون وچرا کا کوئی حق نہیں، اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ دار السلطنت میں سے بھی کچھ لوگ اور وہ بھی اس شدید کشمکش و اختلاف کے ساتھ جس میں ہاتھا پائی تک کی نوبت آئے، پھر جبکہ یہ اجماع کسی اعلان کے ساتھ بھی نہ ہوا ہو اور اس کے لیے لوگوں کو سوچنے کا بھی موقع بالکل نہ دیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ نہ جمہوری سمجھا جاسکتا ہے، نہ عقلی طور پر جائز۔

اس کی صحت کے متعلق پیش کی جاتی ہے تو قرآن کی آیت اور پیغمبرؐ کی حدیث۔ آیت یہ ہے کہ ومن یّشاقق الرسول من بعد ما تبیّن له الهدیٰ و یتّبع غیر سبیل المومنین نوله ما تولیٰ و نصله جهنّم و ساءت مصیرا۔ اس میں صرف اتنے فقرے سے استدلال کیا جاتا ہے کہ "جو شخص مومنین کے راستے کے خلاف اختیار کرے وہ جہنمی ہے"، مگر مومنین پر تو الف لام استغراق ہے جس کے معنی کل مومنین ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ جتنے بھی مومنین جس جگہ جمع ہو کر کوئی فیصلہ کر لیں، وہ صحیح ہوگا، پھر یہ پوری آیت کا مضمون ہے بھی نہیں۔ پوری آیت تو یہ کہہ رہی ہے کہ جو شخص رسولؐ سے جھگڑا کرے اور مومنین کے خلاف طریقہ اختیار کرے، یہ جہنم میں جائے گا۔ اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسولؐ سے جھگڑا کرنا خود مومنین کے خلاف ہے اور تقاضائے ایمانی کے منافی ہے۔ اس سے تو نتیجہ اور خلاف نکلتا ہے، یعنی یہ کہ پیغمبرؐ کے مقابلے کو رائے زنی کا حق نہیں ہے۔

حدیث یہ ہے کہ لا تجتمع امتی علی ضلال (یا) علی خطاءٍ، یعنی پیغمبرؐ کا ارشاد ہے کہ "میری امت کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی یا غلطی پر متفق نہیں ہو سکتی"۔ اگر یہ حدیثیں سند کے اعتبار سے بالکل درست ہوں تب بھی اس میں تمام امت کے اجتماع کا ذکر ہے۔ چند افراد کا جمع ہونا اس میں ہرگز مذکور نہیں ہے۔ معلوم

ہوا کہ اجماع جس معنی سے معیارِ حکومت قرار دیا گیا ہے، اس کی صحت پر کوئی دلیل عقلی یا نقلی نہیں ہے۔

استخلاف: رہ گیا استخلاف، تو ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد ہے اس حکمراں کے حقِ حکومت پر جو دنیا سے جا رہا ہے اور جبکہ اسی کی حکومت کے جواز کا کوئی ثبوت نہیں تو استخلاف کا کیا حق اس سے قائم ہوگا؟

شوریٰ: وہ ساختہ و پرداختہ اس حاکم کا ہے جو باستخلاف معین ہوا تھا اور جس کا خود حاکم ہونا ایک ایسے حاکم کی نامزدگی سے تھا جس کی حکومت خود اپنے محل پر ثابت نہیں ہے۔

قہر و غلبہ: یہ وہی طاقتِ حق والا نظریہ ہے جس کو پہلے غلط ثابت کیا جا چکا ہے پھر اگر قہر و غلبہ ہی معیارِ صحت ہے تو اس میں اسلام کی بھی شرط بلا ضرورت ہے۔ اس کے بعد یہ کیوں نہیں سمجھا جاتا کہ اس میں تمام غیر اسلامی حکومتیں شرعی اور جائز حکومتیں ہیں؟ اس لیے کہ ان میں غلبہ و اقتدار حاصل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود مسلمان بھی تنہا غلبہ واقتدار کو وجہِ سلطنت نہیں سمجھتے بلکہ اسلام کی شرط لگاتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کھلے ہوئے کافر سے اتنا شدید نقصان نہیں پہنچ سکتا جتنا دشنہ زیرِ آستین پنہاں کیے ہوئے کافر یعنی منافق سے۔

اسلام کا نظریۂ حکومت

اب دوبارہ پھر یہ بحث آتی ہے کہ خود اسلام کا نظریۂ حکومت کیا ہے۔ یہ پہلے بیان ہو چکا کہ حکومت کے دو کام ہیں: ایک دستور و قانون کی تشکیل، دوسرے طاقت واقتدار کے ساتھ اس نظام کا اجرا و نفاذ۔

اب پہلے قانون کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے۔ اگر "اسلام" نام ہوتا صرف کچھ عقائد کا جو دماغ میں جگہ پالیں اور انھیں عمل سے تعلق نہ ہو یا کم از کم عمل سے تعلق ہوتا بھی تو صرف انفرادی زندگی میں اسے اجتماعیات سے بحث نہ ہوتی، تو بے شک یہ

ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو قانون کی تشکیل خود کرنے کی ضرورت ہو یا کسی دوسرے ملک کے قانون کی وہ پیروی کر لیں۔ لیکن اسلام تو خود ایک دستورِ حیات پیش کرتا ہے جس میں صرف عقائد نہیں، بلکہ زندگی کے لیے عملی قواعد و ضوابط ہیں اور وہ بھی صرف انفرادی زندگی سے متعلق نہیں، بلکہ ہماری اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں۔ ایک مسلمان اسلام کو قبول کرنے کے ساتھ ہی یہ معاہدہ کر لیتا ہے کہ میں اپنی انفرادی و اجتماعی حیات میں اس ضابطہ و قانون کا پابند ہوں۔ اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ عملی طور پر مسلم رہتے ہوئے پھر خود قانون سازی کرے یا کسی دوسرے شخص کے لیے قانون سازی کے حق کا قائل ہو یا پوری قوم مجتمع طور پر قانون سازی کے کام میں شریک ہو۔ یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا، جبکہ وہ مسلم ہے اور اسلام کے ساتھ ہی وہ اپنے کو قانونِ اسلام کے سپرد کر چکا ہے۔

موجودہ زمانے کے بعض مفکرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قانون ساز کو اس جماعت سے خارج ہونا چاہیے جس کے لیے قانون بن رہا ہے تاکہ وہ قانون زیادہ سے زیادہ بے لوث اور غیر جانب دار ہو سکے، اس لیے زیادہ مناسب طریقہ یہ ہے کہ ایک ملک کے لیے قانون دوسرے ملک کے مدبرین سے بنوایا جائے، مگر یہ تو اس وقت صحیح ہے جبکہ قانون کا دائرہ شروع ہی سے ملک یا اقلیم کے لیے ہو۔ لیکن قانون ملکوں اور قوموں کی تفریق سے بالاتر ہو، یعنی تمام نوعِ انسانی کے لیے ہو تو پھر مذکورہ اصول کے مطابق اس کے سوا کیا صحیح ہو سکتا ہے کہ قانون ساز نوعِ انسانی کی جماعت سے خارج ایک بلند ذات ہو، یعنی خالقِ عالم جس کا علم و قدرت سب کو محیط ہے، یہی اسلام کا نظریۂ حکومت ہے۔ یہاں قانون ساز بھی اللہ ہے اور حاکم بھی صرف اللہ ہے۔ ایک مسلم اسلام کے ساتھ ہی اس کی اور صرف اس کی بادشاہت کو مان لیتا ہے جس کے بعد کسی فرد، کسی مجلس یا کسی قوم کا حکومت کرنا اللہ کے حق کا غصب کرنا ہے اور اس کے بعد ارسطو کی تینوں قسمیں حکومت کی ختم ہو جاتی ہیں۔ جب ایک حاکمِ حقیقی موجود ہے اور وہ اللہ ہے تو ایک فرد کی بھی حکومت غلط، چند آدمیوں کی بھی حکومت

غلط اور بہت سوں کی بھی حکومت غلط۔

اس کا نتیجہ ہے آزادیِ کامل، یعنی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں رہتا یا یوں کہوں کہ کسی ایسی طاقت کا محکوم نہیں رہتا جس کا دباؤ فطرت کی قیود سے باہر ہے۔ رہ گیا خالق، اس کی اطاعت فطری طور پر بہرحال کرنا ہی ہے۔ اگر ارادی افعال میں بخوشی نہ کرے گا تو اضطراری اور فطری افعال میں بجبر کرے ہی گا۔ اسی لیے ارشاد ہوا: له اسلم من فی السمٰوٰت والارض طوعاً و کرھاً۔ مگر انسان کا شرفِ انسانی اس کا مقتضی ہے کہ وہ اس اطاعت کو اختیار کرے تاکہ اس کی حق شناسی کا ثبوت ملے بے شک چونکہ اس کے قانون کے معلوم کرنے کے لیے ہم الفاظ کے محتاج ہیں اور خالق کی ذات ایسی نہیں کہ وہ ہم تک پہنچ کر ہم سے بات کرے، اس لیے ایک واسطے کی ضرورت ہے۔ یہ رسولؑ ہے، مگر اس کا کام احکامِ الٰہیٰ کا پہنچانا ہے۔ نہ اس کا ذاتی کوئی حکم ہے اور نہ اس کی ذاتی اطاعت ہے بلکہ جو اس کی زبان پر آتے ہیں، وہ احکامِ الٰہیٰ ہیں (وما ینطق عن الھوی ان ھو الاّ وحیٌ یوحی) اور جو اس کی اطاعت ہے، وہ حقیقت میں اللہ کی اطاعت ہے (ومن یّطع الرّسول فقد اطاع اللّٰہ)۔

اب جبکہ حکومت اللہ کی ہے تو ہر دور میں اپنے نائب مقرر کرنا اسی کا کام ہے اور اس اختیار کو کسی وقت میں بھی اپنے ہاتھ میں لینا اللہ کے حقِ حکومت میں مزاحمت کرنا ہے جو ایک مسلم کے شایانِ شان نہیں ہے۔ قرآن مجید نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ وما کان لمومن ولا مؤمنة اذا قضی اللّٰہ ورسوله امراً ان یکون لھم الخیرة من امرھم: "کسی مومن یا مومنہ کو اللہ اور رسولؑ کے فیصلے کے سامنے اپنے معاملات کے بارے میں کوئی اختیار نہیں رہتا"۔ دوسری جگہ زیادہ واضح کلیے کی شکل میں اعلان کیا ہے کہ وربّک یخلق مایشاء یختار وما کان لھم الخیرة: "پروردگار جو چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے، منتخب کرتا ہے۔ انھیں انتخاب کا حق نہیں ہے"۔

اس کے علاوہ سنتِ الٰہیہ جو قرآن مجید کے تتبع سے ظاہر ہوتی ہے، وہ یہی ہے، یہاں تک کہ اس کی طرف کا حکمراں خود اپنے لیے اس کام میں مددگار بھی خود اپنی طرف

سے مقرر نہیں کرتا بلکہ اللہ سے دعا کرتا ہے (اشرکہ فی امری) ۔اور محدود مقصد، یعنی دشمن کے مقابلے کے لیے ایک سردار بھی جو نبی یا رسول نہیں بلکہ "ملک" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ بھی قوم خود نہ مقرر کر سکی، بلکہ نبی سے خواہش کی ابعث لنا ملکاًنقاتل فی سبیل اللّٰہ اور نبیؑ نے بھی خود نہ مقرر کیا، بلکہ یہ کہا کہ ان اللّٰہ قد بعث لکم طالوت ملکاً: "اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے"۔ پھر قوم نے اس کے استحقاق پر اعتراض کیا۔ وہ اعتراض اور قوم کا حق مداخلت بھی قبول نہ کیا گیا، بلکہ اس ذیل میں ایک کلیے کا اعلان کر دیا گیا کہ و اللّٰہ یوتی ملکہ من یشاء: "اللہ اپنے ملک کو جسے چاہتا ہے، دیتا ہے"۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ حاکم حقیقی اللہ ہے تو اللہ ہی نائب کو مقرر کر سکتا ہے اور یہی نائب انسانی جماعت میں ہمارا اصلی رہنما بن سکتا ہے۔

مسلمانوں نے اس حاکم کے انتخاب کے حق کو اللہ سے سلب کر کے اپنے ذمے لے کر بڑا نقصان اٹھایا۔ بایں معنی کہ اگر وہ اصول مقرر رہتا تو پھر من و تو کا سوال پیدا ہو کر انتشار پیدا کرتا۔ دیکھ لیجیے کہ رسولؑ کو اللہ کی طرف سے مان لیا گیا، پھر ایسا تو نہیں ہوا کہ مسلمانوں میں دو رسول ہو جاتے۔ قبلے کو اللہ کی طرف سے مان لیا، پھر یہ نہیں ہوا کہ دو قبلے ہو جاتے اور کتاب کو اللہ کی جانب سے مانا، پھر یہ نہیں ہوا کہ دو قرآن ہو جاتے۔ اختلاف بس اسی وقت سے پیدا ہوا جب سے حاکم کے انتخاب کو اللہ کے بجائے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بس اس کے بعد سے جو مسلمانوں کے شیرازے میں انتشار پیدا ہوا تو آج تک باقی ہے۔

پیغمبر کا اعلان و عمل اس بارے میں منخدر ہے کہ حاکم کے تقرر میں رعایا کا دخل نہیں۔ ایک عرب سردار نے جب اپنے اسلام لانے کی شرط یہ قرار دی کہ اپنے بعد حکومت میں میرا حصہ قرار دے دیجیے تو حضرتؐ نے جواب میں صاف فرما دیا، "اس کا مجھے اختیار نہیں، یہ تو اللہ سے متعلق ہے"۔ اب جو حضرتؐ نے بیعتِ عشیرہ میں حضرتِ علیؑ ابن ابی طالبؑ کے بارے میں اعلان کیا کہ یہ میرا وزیر، وصی اور خلیفہ ہے تو

بحیثیتِ مسلمان یہ ماننا لازم ہے کہ یہ حضرتؐ کا اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر اعلان نہیں ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے اعلان ہے اور اس اعلان سے بھی یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ خود قوم کے اختیار سے متعلق نہیں ہے ورنہ رسولؐ اس کو اپنے ذمے نہ لیتے۔ اسی بنا پر غدیر کے خطبے میں پیغمبرؐ نے ولایتِ علیؑ کے اعلان سے قبل پہلے مسلمانوں سے اصول تسلیم کرالیا اس استفہام کے ساتھ کہ الست اولیٰ بکم من انفسکم قالوا بلیٰ: "کیا میں تم سب سے زیادہ اختیار نہیں رکھتا ہوں؟" سب نے کہا، "بے شک آپ زیادہ اختیار رکھتے ہیں"۔ اب اس کو تسلیم کرنے کے بعد تو مسلمانوں کو اپنے خود مختاری کے حق کا حکومت کے بارے میں دعویٰ کبھی صحیح قرار ہی نہیں پاسکتا، اور اسی لیے رسولؐ کی زندگی میں یہ صدا کسی دہن سے بھی نکلتے نہیں سنائی دیتی کہ حکومت ہمارا حق ہے یا حاکم مقرر کرنا ہمارا کام ہے۔ہاں! رسولؐ جب دنیا سے اٹھ گئے تو اب اجماع اور شوریٰ اور قہر و غلبہ کا نام سنائی دینے لگا، مگر یہ مسلمانوں کے خود ساختہ اصول ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۶۰ھ تک حکومت کے یہ اصول جمہور مسلمین میں تسلیم کیے جاتے رہے اور عام نظریہ یہی قائم رہا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب ان تین طریقوں میں سے کسی ایک سے حاکم کا تعین ہو جائے تو کسی کو مخالفت کا حق نہیں، اور اگر کوئی مخالفت کرے اور حاکم اس کے خلاف تادیبی مہم جاری کرے تو حاکم کا فعل درست اور جو شخص اس کے خلاف ہو، وہ مجرم اور اگر اس سلسلے میں قتل ہو جائے تو گمراہی کے ساتھ ہلاک شدہ سمجھا جائے گا، شہید اسے نہیں کہا جاسکتا۔

یہی اب تک عمل درآمد رہا تھا جس کے شواہد تاریخ میں بہت ہیں۔ امیرِ شام معاویہ نے اپنے فرزند یزید کے لیے نہ صرف ان طریقوں میں سے کوئی ایک، بلکہ ان تمام طریقوں کو جمع کر دیا۔ انھوں نے شام اور عراق کے علاوہ مکے اور مدینے میں خود جا کر جلسے کیے اور یزید کی بیعت لی۔ اس طرح جتنا بڑا اجماع یزید کی خلافت پر ہوا، ایسا اس سے پہلے کسی خلیفہ پر بھی نہ ہوا تھا۔ اس کے ساتھ استخلاف بھی تھا اور قہر و غلبہ بھی

اس کا نتیجہ صاف ہے کہ کسی شخص کو مخالفت کا حق نہ ہونا چاہیے اور مخالفت کرے تو بادشاہ کو اس کے خلاف ہر کارروائی کا حق اور وہ اگر قتل ہو جائے تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں۔ مگر حسینؑ ابن علیؑ کا یہ کارنامہ تھا کہ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اس بادشاہ کے مقابلے کے لیے اور پھر اپنے ساتھ بے گناہی اور مظلومیت کی طاقت کو ایسا زبردست بنا دیا کہ دنیا حسینؑ کو مظلوم اور یزید کو ظالم ماننے پر مجبور ہوئی۔ حسینؑ اور ان کے ساتھی سب شہید تسلیم کیے گئے اور یزید ہمیشہ کے لیے مردود و ملعون قرار دیا گیا اس طرح حسینؑ نے اس نظریۂ حکومت کا تختہ الٹ دیا جو اسلامی نظریے کے خلاف مسلمانوں میں غلط طور پر مان لیا گیا تھا۔

مسلمانوں کا نظریۂ حکومت مادی اسباب، یعنی عوام کے اتفاق برائے انتخاب یا حصول تاج و تخت کا محتاج ہے، مگر اسلامی نظریۂ حکومت ان اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ تمام دنیا انکار کر رہی ہو، مخالفت پر کمربستہ ہو بلکہ قتل پر تیار ہو، گوشہ نشینی و کسمپرسی ہو، پیوند دار لباس اور فرش حصیر ہو، لیکن اگر وہ اسلامی قانون کا سب سے بڑا واقف اور سب سے بڑا عمل پیرا اور اس کے محافظ ہونے کا اہل ہے اور اللہ کی طرف سے اس منصب پر مقرر ہوا ہے تو وہ "الہیٰ حاکم ہے" اور دنیا پر اس کی اطاعت فرض ہے اور جو حکومتِ الٰہیہ کے ماننے والے ہیں، وہ اسی کو اپنا حاکم تسلیم کرتے رہیں گے اور جو بھی دنیا کا حاکم اپنے مادی اقتدار کی بنا پر تسلط قائم کرے گا، اسے ہمیشہ غاصب سمجھیں گے، چاہے وہ حکمران ظاہری طور پر اپنے کو مسلمان بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس فرقے کا پیرو بتاتا ہو جس میں حکومتِ الٰہیہ کے نظام کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ حکومتِ الٰہیہ کا ایک پیرو کبھی کسی طاقت کا محکوم نہیں ہو سکتا، یعنی اگر حالات کی نامساعدت سے وہ کسی دوسرے نظامِ اقتدار کے شکنجے میں اسیر بھی ہو گا تو ہمیشہ اس پر نظر رکھے گا کہ اللہ کا حکم اس کی نسبت کیا ہے۔ اگر اس نے یہ محسوس کیا کہ ان حالات میں حفاظتِ جان و مال یا کسی بلند مقصد کے تحفظ کی خاطر حکمِ الہیٰ یہی ہے کہ ہمیں خاموشی کے ساتھ قانونِ سلطنت پر عمل کرنا چاہیے تو وہ عمل کرے گا جسے دنیا سمجھے کہ وہ حکومتِ

وقت کے احکام کی اطاعت ہے، مگر حقیقت میں اپنے حاکمِ اصلی اللہ کی اطاعت کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اتفاق سے نتیجہ اس کا حاکمِ وقت کے قانون کی پیروی کے مطابق ہو گیا ہے، لیکن اگر وہ اپنے حاکم اللہ کا یہ منشا دیکھ لے گا کہ ان حالات میں پیروی جائز نہیں ہے تو وہ جان دینا گوارا کر لے گا، گھر کا برباد ہونا قبول کرلے گا مگر جہاد کے لیے کھڑا ہو جائے گا۔

حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دشواری

یہ تو حکومتِ الٰہیہ کی اصل حقیقت ہے جو ہر انسان کی انفرادی زندگی میں بھی کار فرما ہے، لیکن جہاں تک اس کے ظاہری اقتدار کا تعلق ہے، وہ افرادِ صالح کے وجود پر موقوف ہے، اور اگر صالح افراد اتنی تعداد میں نہ موجود ہوتے تو وہ نائبِ حکومت موجود ہوگا جسے خصوصیت کے ساتھ بذریعۂ پیغمبر نامزد کیا گیا اور پھر بھی دنیا اس کی حکومت کو تسلیم نہ کرے گی اور اسے گوشہ نشین ہو جانا پڑے گا اور یہ سلسلہ ۲۶۰ برس تک جاری رہے گا جو اس کے تجربے کے لیے کافی ہے کہ افرادِ صالح کا فقدان حکومتِ الٰہیہ کے ظاہری طور پر برسرِ اقتدار آنے میں مانع ہے، لہذا اگر اس کے بعد نائبِ خاص ہماری نگاہ سے اوجھل ہو جائے تو اس کا سبب افراد کی عدمِ صلاحیت ہی قرار پائے گی۔ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ جب حکمراں نائب ہے تو حکومت کیسے قائم ہو۔ یقیناً اگر اس وقت افرادِ صالح پیدا ہو جائیں تو حاکمِ حقیقی کی ذمے داری ہوگی کہ وہ اپنے نائب کو ہمارے سامنے ظاہر کر دے، جبکہ ایسا نہیں ہے تو موجودہ حالات میں حکومتِ الٰہیہ کے برسرِ اقتدار آنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

یوں نظری حیثیت سے کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت یہ حق حکامِ شرع، یعنی علمائے دین کا ہے، مگر مادی رجحانات کی رو میں ہمیں یقین ہے کہ اگر اس طرح کی تشکیل کا ارادہ کیا جائے تو خود اس طبقے میں جو منصبِ حکومت کا اہل سمجھا جائے، بہت سے افراد برسرِ اقتدار آنے کی کوشش کریں گے جو شاید اس کے اہل نہ ہوں اور ان افراد کو

گوشہ نشین رہنا پڑے گا جو اس کے واقعاً اہل قرار پا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نتیجے میں وہ حکومت بھی حکومتِ الٰہیہ نہ ہوگی چاہے وہ حکومت شرع کے نام سے قائم کی گئی ہو صرف اس لیے کہ افرادِ صالح ہمارے علم میں نایاب ہیں اور ہوں تو یقیناً گوشہ ہائے گمنامی میں ہیں جن کا تعارف بھی دنیا کو نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یہ یقینی سمجھنا چاہیے کہ جو بھی حکومت قائم ہوگی، وہ "غیر الٰہیہ" ہی ہوگی، چاہے وہ غیروں کی ہو اور چاہے اپنوں کی ہو، لیکن حکومتِ الٰہیہ کے علاوہ کسی اقتدار کی تنظیم اور کسی ادارے سے غیر مشروط معاہدۂ تعاون یا بیعت کسی طرح جائز نہیں، جبکہ اللہ کے ساتھ یہ معاہدہ کیے ہوئے ہیں کہ ہمیں اس کے احکام پر عمل کرنا ہے تو کسی جماعت کے نظامِ عمل کو ہم غیر مقید طریقے پر کیسے قبول کر سکتے ہیں؟ جبکہ یہ ممکن ہے کہ اس نظامِ عمل میں ایسی صورتیں پیدا ہوں کہ ہمیں حکومتِ الٰہیہ کے احکام کی تکمیل میں اس کی مخالفت لازم ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں ہر حکومت کے ساتھ امنِ عام کی خاطر تعاون کرنا لازم ہے مگر آزاد رہ کر یعنی خود اپنے فرض کے احساس سے صحیح طریقۂ عمل کو معلوم کر کے، لیکن کسی جماعت کے طریقے کا پابند ہو کر عمل کرنا یہ حکومتِ الٰہیہ کی پابندی کے منافی اور ہمارے ائمۂ معصومین علیہم السلام کی سیرت کے خلاف ہے۔

اسلام اور طبقاتی نظام

کیا اسلام نے انسانی سماج کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے؟

حجۃ الاسلام رئیس العلماء مولانا سید کاظم نقوی مجتہد العصر مدظلہ

بسمہ تعالیٰ و لہ الحمد

خودداری اور شرافتِ نفس انسان کا جوہرِ فطرت ہے۔ جس نظامِ اقتصادی کی رفتار اس تقاضائے طبعی سے الگ ہوگی، عقل اس کے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ اسلامی نظام نہ صرف عدالتِ اجتماعی کے خلاف ہے، بلکہ وہ انسان میں احساسِ کمتری پیدا کر دیتا ہے۔ اسلام ہمیشہ نوعِ انسانی کو دو حصوں میں منقسم دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی حکومت میں دائمی طور پر ایک طرف بلند و بالا، پرہیبت، باشوکت، عیش و راحت کے سامانوں سے ابلتے ہوئے قصر نظر آتے ہیں جن میں رہنے والوں کی صورتیں بارونق، مطمئن اور ہشاش بشاش ہیں.... دوسری طرف پست و حقیر، تنگ و تاریک، آبادی سے دور، ساز و سامان سے خالی جھونپڑوں کی ایک طویل لائن دکھائی دیتی ہے۔ان میں زندگی کے دن کاٹنے والوں کے چہروں پر پریشاں حالی کے لائے ہوئے آثار، اضمحلال، ان کی آنکھوں میں فقر و فاقہ کے ڈالے ہوئے حلقے، ان کے جسموں پر بے جوڑ، پرانے پھٹے ہوئے کپڑے ہیں۔ ان کے بچوں کی دھوپ میں تونسائی ہوئی رنگت اور بھولی بھالی کملائی ہوئی صورت دیکھ کر کلیجا منھ کو آتا ہے۔

کیا اسلام کی عدالتِ اجتماعی یہی ہے کہ لوگ دولت مندوں کی نگاہِ کرم کا آسرا لگائے، ان کے سر سے اترے صدقے کے چند ٹکڑوں کے لیے ہمیشہ دونوں ہاتھ پھیلائے رہیں؟ کیا اس میں انسان کی کھلی ہوئی تذلیل اور آبروریزی نہیں ہے؟

یہ ان دماغوں کے خیالات ہیں جن پر اشتراکیت اور بے دینی پوری طرح تسلط پا چکی ہے۔ انھوں نے بیرونی خیالات سے متاثر ہو کر، اسلام سے بدعقیدگی اور بدگمانی کی بنا پر اس میں غور و خوض کرنے کی ذرہ بھر زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ ان کے نزدیک خمس و زکاۃ بھیک ہے جو مال دار احسان و تفضل کے طور پر فقیروں کو دیتے ہیں۔

صدقے کا لفظ دھوکا نہ دے

انسان کی بالغ نظری کا تقاضا ہے کہ لفظی گرفتوں سے بالاتر ہو کر الفاظ کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ قرآن مجید کی آیت خذ من اموالھم صدقۃ کو دیکھ کر دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ لغت میں چونکہ صدقہ ہر اس عطیے کو کہتے ہیں جو بغرض ثواب دیا جائے، لہٰذا اس آیت میں زکاۃ کے لیے صدقے کا لفظ صرف کر دیا گیا ہے۔ احسان اور مہربانی کا پہلو اس صدقے میں ہو سکتا ہے جو اپنی مرضی سے نکالا جائے، اس میں حکومت کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتی ہے، لیکن زکاۃ کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا ادا کرنا قانونِ حکومت کی رو سے ضروری ہے۔ جو شخص اس کے دینے سے انکار کرے، اسے حکومتِ اسلامی کا مخالف سمجھا جائے گا۔

نظامِ اسلام میں خمس و زکاۃ کی حقیقی نوعیت سمجھنے کے لیے مندرجۂ ذیل حقیقتوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

خمس و زکاۃ قانونی ٹیکس ہیں

دنیا کی تاریخِ اقتصادیات میں زکاۃ سب سے پہلا باضابطہ ٹیکس ہے جو حکومت

نے عوام کے لیے واجب الادا قرار دیا ہے۔ اسلام سے پہلے ٹیکس کی مقدار معین نہیں تھی۔ حکامِ وقت اپنی ذاتی ضروریات کے لیے جتنا چاہتے، اپنے زیر دستوں سے وصول کر لیتے تھے۔ لطف یہ کہ اس کا بار دولت مندر اور متوسط طبقے کو چھوڑ کر فقیروں کے اوپر ہوتا تھا۔ اسلام نے پہلے پہل ٹیکس کی مقدار اور اس کی وصولی کو منظم کیا، اس کا بوجھ محض مال دار اور متوسط الحال طبقے کے کاندھوں پر ڈالا، فقرا کو بالکل سبک دوش کر دیا خمس و زکاۃ کی نوعیت ان صدقات سے مختلف ہے جس کا دار و مدار اغنیا کی مرضی پر ہے، وہ حکومت کا عائد کردہ واجب الادا ٹیکس ہے۔ ان اموال کا مستحقین تک پہنچانا حکومت کی طرف سے ایک خدمت ہے جس پر صاحبانِ مال کو مامور کر دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ضرورت مند اشخاص کو ذلت و حقارت کا احساس کس بنا پر ہوگا؟

اسلام نے فقیروں کو شریکِ مال قرار دیا ہے

فقۂ جعفری میں فریضۂ زکاۃ مال داروں کے ذمے نہیں عائد کیا گیا ہے۔ اس کی نوعیت قرض سے بالکل جداگانہ ہے۔ وجوبِ زکاۃ کا تعلق خود ان اشیا سے ہوتا ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ اس امر کے ثبوت کے لیے جلیل القدر، بلند پایہ علماؑ کی مندرجۂ ذیل عبارتیں کافی ہیں:

۱) انما مال علی الحول و الزکوٰۃ تجب فی عین المال دلیلنا اجماع الفرقہ۔

(خلاف، شیخ طوسیؒ)

۲) الزکوٰۃ تجب فی العین لا فی الذمۃ ذھب الیہ علمائنا۔

(منتہی، علامہ حلیؒ)

۳) لا ریب فی تعلقھا بالعین فی الغلات الوارد فیھا العشر و نصفہ و نحوھا ما ھو حقہ منتشاعۃ فی العین الخارجیّۃ بل و فی غیرھا کالنقدین و الانعام۔

(جواہر الکلام، علامہ محمد حسنؒ)

۴) ان الزکوۃ تجب فی العین لا فی الذمۃ علی المشہور کما عن المفاتیح وغیرہ بل لم ینقل الخلاف فیہ عن احد بن اصحابنا بل عن غیر واحد دعوی اجماعھم۔

(مصباح الفقاہتہ، علامہ آغا رضا)

۵) الاقوی ان الزکوۃ متعلقۃ بالعین کما ھو المشہور۔

(مستمسک العروۃ الوثقیٰ)

خمس و زکاۃ کے نفس اموال سے تعلق کا نتیجہ صاف ہے کہ مقررہ شرائطِ وجوب کے موجود ہونے کے بعد فقرا اموال اغنیا میں بمقدارِ فریضہ ان کے شریک ہو جائیں گے امام جعفر صادق علیہ السلام کا صریح ارشاد ہے:

ان اللّٰہ تبارک و تعالیٰ شرک بین الاغنیاء و الفقراء فی الاموال

خداوندِ عالم نے تمام اموال میں فقرا کو مال داروں کا شریک قرار دے دیا ہے۔

وجوبِ زکاۃ کے شرائط موجود ہونے سے پہلے اغنیا اپنے اموال کے بلاشرکتِ غیر تنہا مالک تھے، لیکن تعلقِ زکاۃ کے بعد فقیر ان کے حصے دار بنا دیے گئے ہیں۔ کیا اس حقیقت کے فقرا پر منکشف ہونے کے بعد بھی انھیں دولت مندوں سے خمس و زکاۃ لینے میں شرم آئے گی؟ کیا ایک حصے دار کو اپنے شریکِ مال سے اپنا حق وصول کرتے ہوئے احساسِ کم تری دامن گیر ہوتا ہے؟

بے شک ضرورت ہے کہ یہ قانونی نکات غریب و امیر، دونوں طبقوں کے اچھی طرح ذہن نشین کر دیے جائیں۔ ان کے شعور و احساس کی گہرائیوں میں ان حقائق کو بخوبی پیوست ہو جانا چاہیے۔ قرآن مجید اور راہنمایان اسلام نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے قوم کی ذہنیت بدلنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ہدایت کی گئی کہ:

امنوا باللّٰہ و رسولہ و انفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ

خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اس مال سے راہِ خدا میں کچھ خرچ
کرو جس میں اس نے تمھیں اپنا قائم مقام قرار دیا ہے۔

(سورۂ حدید)

قرآنِ مجید مال داروں کے ذہن میں یہ بات راسخ کرنا چاہتا ہے کہ تمھاری دولتوں کا اصل مالک خدا ہے۔ اس نے ان کو عارضی طور سے تمھارے پاس رکھ دیا ہے۔ تم راہِ خدا میں کچھ دے کر یہ خیال نہ کرو کہ اسے تم نے کچھ اپنی جیب سے دے دیا۔ تمھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ تم نے ایک امانت اس کے حق دار تک پہنچا دی۔ ان تصورات کے ساتھ اگر خمس وزکاۃ دیا جائے تو نہ مال داروں کے لیے احساسِ برتری پیدا ہونے کا موقع ہوگا اور نہ فقیروں کو احساسِ کم تری پیدا ہونے کا موقع ہوگا۔

ضرورت مندوں کی کفالت حکومت کر رہی ہے

شیخ مفید علیہ الرحمہ کے نزدیک صرف زکاۃ اور علامہ حلبی کے نزدیک خمس و زکاۃ، دونوں کی تقسیم حکومتِ اسلامی کے ہاتھوں ہوگی، ادا کر دینے کے بعد ان سے صاحبانِ مال کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ خمس و زکاۃ کی وصولی کی طرح مستحقین تک پہنچانے کا ذمے دار حاکمِ شرع ہے۔

ظاہر ہے کہ کسبِ معاش سے عاجزی یا آمدنی کے مصارف کے لیے ناکافی ہونے کی شکل میں اگر حکومت کچھ لوگوں کی کفالت اپنے ذمے لے لے تو اس میں بے عزتی اور آبرو ریزی کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ دنیا کی کسی زبان اور عالم کی کسی تہذیب و تمدن میں اس عمل کو احسان و تفضل سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ بے شمار تلخ تجربوں اور مظالم کے خوں ریز دریا میں برسوں انسانیت کے ہاتھ پیر مارنے کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ عاجز و محتاج اشخاص کی کفالت حکومت کے ذمے ہونی چاہیے۔ اس تصور کی عمر بہت کم ہے۔ یقیناً اسلام کے لیے فخر و نازش کا موقع ہے کہ اس نے یہ اصول اس وقت دنیا کے سامنے پیش کیا جب یورپ جہالت و بربریت کے جھولے میں پینگ لے رہا تھا۔

یہ بڑی تنگ نظری اور فکری بے مائیگی کی بات ہے کہ جب کوئی نظام مغربی یا مشرقی یورپ کے راستے سے آئے تو اسے بے چون وچرا مان کے سر آنکھوں پر جگہ دی جائے، لیکن جس وقت اسی کو اسلام اپنی تعلیمات کا جز قرار دے تو اسے تنزل وانحطاط، قدامت پرستی اور رجعت پسندی کے الفاظ سے سرفراز کیا جائے۔

رفاہِ عام کے ادارے قائم کیے جاسکتے ہیں

یہ حقیقت ہے کہ صدرِ اسلام کے تمدنی حالات میں خمس وزکاۃ کی امانتیں فقرا تک پہنچانے کی صرف دو شکلیں تھیں۔ایک یہ کہ خود ان اشیا کو انھیں دے دیا جائے جن میں فریضۂ خمس وزکاۃ عائد ہوا ہے، دوسرے یہ کہ ان چیزوں کی قیمت نقدان کے ہاتھ پر رکھ دی جائے۔حکامِ شرع کے تشریحات میں خمس وزکاۃ کی تقسیم کے لیے محض ان دو صورتوں کا ذکر اس لیے ملتا ہے کہ اس وقت کے ماحول میں اور کوئی تیسری صورت ممکن نہ تھی۔قانونی طور پر اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ فقرا و مساکین کے ہاتھ میں اموالِ خمس وزکاۃ دینے کے بجائے ان کی تعلیم وتربیت کے واسطے حکومت کی طرف سے مفت مدارس قائم کر دیے جائیں، علاج وتدارک کے لیے مجبور بیماروں کے لیے شفاخانے بنا دیے جائیں، کارخانوں اور فیکٹریوں کی شکل میں ان کے واسطے مستقل وسائلِ معاش مہیا کر دیے جائیں۔

یہ تصرفات اگر حکومتِ اسلامیہ کے اصلی وارث امامِ معصوم کے ہاتھوں میں ہوں تو ان میں فقرا و مساکین کی رضامندی حاصل کرنا شاید ضروری نہ ہو، کیونکہ امام کو افرادِ امت کے نفوس واموال پر کامل اختیار ہے۔ان کو ہر شخص کے مصالح کا خود اس سے زیادہ لحاظ ہے۔غیبتِ امام میں یہ منصب جامع الشرائط مجتہدین کی طرف پلٹتا ہے۔وہ ان تصرفات کے لیے مالکانِ اموال کی رضامندی کے بعد قطعاً مجاز ہیں۔کھلی ہوئی بات ہے کہ جن خوددار اور شریف النفس لوگوں کو براہِ راست خمس وزکاۃ لینے میں احساسِ کم تری دامن گیر ہوتا ہے، انھیں ایسی باعزت اور باضابطہ تقسیم میں کیا

عذر ہو سکتا ہے ؟

رہ گیا مستحقین کا وہ گروہ جو کم سنی، بیماری یا کسی اور عذر کی بنا پر کام کرنے سے عاجز ہے تو اس کی گزر بسر کا انتظام خمس و زکاۃ سے خود حکومت کرے گی ۔ احساسِ کم تری کسی شخص کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں ہو سکتا ہے، لیکن حکومت کی جانب سے کفالت میں، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، توہین و تحقیر کا کوئی شائبہ نہیں ہے ۔ اس کے بعد بھی اگر کسی کو کم تری و پستی کا احساس ہو تو اس کا تدارک کیا ہے ؟ اس طرح کے افراد کے لیے آخر نظامِ اشتراکی نے وہ کون سا کفالت کا اسلوب اختیار کیا ہے جو احساسِ کم تری کو بالکل پیدا نہ ہونے دے ؟ شاید وہاں اس طرح کے ناکارہ اور مجبورِ محض لوگوں کو گولی مار کر ختم کر دیا جاتا ہو!

احساسِ کم تری کا کوئی ایک سبب نہیں ہے

نظامِ فطرت میں تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا ۔ افرادِ انسانی کی افتادِ طبع کا اختلاف ناقابلِ ترمیم تکوینی حقیقت ہے ۔ جو بات ایک شخص کے لیے احساسِ کم تری کا باعث ہے، اسی سے دوسرے کو اپنی پستی اور حقارت کا کوئی تصور نہیں ہوتا ۔ جو طبائع تخلیقی طور پر خود دار اور زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں، انھیں قدم قدم پر احساسِ کم تری سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ احساسِ کم تری کا کوئی ایک سبب نہیں ہے جس پر آپ قابو پا لیں ۔ تمام اسباب کو ناپید کر دینا آپ کے بس سے باہر ہے ۔ پستی اور کم تری کا احساس صرف بیرونی مادی چیزوں سے نہیں پیدا ہوتا ہے تاکہ انھیں حکومت کے ہاتھ میں دے کے اور سب پر برابر سے تقسیم کر کے آپ احساسِ کم تری کا دروازہ بند کر دیں آخر قدرتی اور اکتسابی معنوی امور میں جو تفاوت ہے، اسے کیونکر دور کیجیے گا ؟ ہر طالبِ علم اپنے مطلوب کے سامنے کم تری محسوس کرتا ہے، لہٰذا دلوں سے شوقِ طلب کو کھینچ لیجیے ۔ ہر شاگرد اپنے استاد کے مقابل پستی محسوس کرتا ہے، لہٰذا تمام کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں قفل لگا دیجیے ۔ ہر کامیاب وکیل اور ڈاکٹر کے مقابلے میں اس کے

دوسرے ہم پیشہ اپنے کو سبک پاتے ہیں، لہذا وکالت اور ڈاکٹری کا ڈپلوما دینا موقوف کر دیجیے۔ہر آتش بیان، قادر الکلام، فاصل خطیب دوسرے متکلمین کے چراغ بجھا دیتا ہے لہذا خطابت و تقریر قانوناً ممنوع قرار دے دیجیے۔ہر معجز نگار صاحبِ طرز انشاپرداز سے دوسرے مضمون نویس آنکھیں چراتے ہیں، لہذا ان کے ہاتھ سے قلم چھین لیجیے۔ہر طباع و ذہین شخص سے غبی اور کند ذہن شرمندہ ہوتے ہیں، لہذا دماغ کا آپریشن کر کے ذکاوت و ذہانت کو نکال دیجیے۔ہر فلک سیر، خوش نگاہ، خوش فکر شاعر سے دوسرے شاعروں کی نگاہیں نیچی ہوتی ہیں لہذا شعر و شاعری پر پہرے بٹھا دیجیے۔ہر طاقت ور اور قوی الجثہ شخص کے مقابل کمزور اور لاغر شخص کو احساس کم تری ہوتا ہے، لہذا اس کی طاقت کو کسی طرح سلب کر لیجیے۔

ذرا انصاف کیجیے! کیا ان غیر مادی صلاحیتوں کو انجکشنوں کے ذریعے تمام افرادِ انسانی کے دل و دماغ میں مساوی طور پر آپ پہنچا سکتے ہیں؟ جب تک لوگوں کے درمیان استعداد، قابلیت اور تکوینی صفات میں تفاوت ہے، احساس کم تری اور احساس برتری کسی سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔ہاں! دونوں سے نجات صرف ذہنی اصلاح کے توسط سے ہو سکتی ہے جس کا بندوبست اسلام نے اخلاقی تربیت کے ذریعے کیا ہے۔

یہ عظیم غلط فہمی ہے

ان لوگوں نے اسلام کو سمجھنے کی بالکل کوشش نہیں کی ہے جن کا خیال ہے کہ وہ نوعِ انسانی کو ہمیشہ دو طبقوں میں منقسم دیکھنا چاہتا ہے: اغنیا اور فقرا قانونِ اسلامی میں کوئی ایسی دفعہ نہیں ملتی ہے جو جامعۂ مسلمین میں طبقۂ فقرا کی موجودگی لازمی قرار دے جن کی گزر بسر اموالِ خمس و زکاۃ کے ذریعے ہو۔اس کے برعکس اسلام کے نظامِ اقتصادی کی تدوین ایسے حکیمانہ انداز سے کی گئی ہے کہ اس کے نفاذ و اجرا کے بعد فقیر نظر آنا ممکن نہیں ہے۔

تاریخ اسلام فخر کے ساتھ عمر بن عبدالعزیز کے دورِ خلافت و حکومت کی طرف دعوتِ نظر دے رہی ہے ۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جب یحییٰ بن سعید نے افریقہ سے اموالِ زکاۃ وصول کر کے انھیں مستحقین پر تقسیم کرنا چاہا تو پورے عالمِ اسلام میں ایک بھی فقیر دستیاب نہیں ہو سکا؟ فقیر سرے سے ناپید ہونے کی وجہ سے یحییٰ بن سعید کو یہ اموال غلام آزاد کرانے میں صرف کرنا پڑے ۔ اسلامی نظامِ تمدن میں کسی ایسے طبقے کا وجود ضروری نہیں ہے جس کا مستقل ذریعۂ معاش خمس و زکاۃ کے اموال ہوں ۔ بے شک چونکہ فقر و احتیاج ہمہ گیر بیماری ہے جس کا حملہ دنیا کے ہر سماج پر کبھی نہ کبھی ہوتا ہے ، لہذا ایک دانش مند ، دستور ساز اور مدبر قانون گزار کی دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ وہ اس مہلک مرض کے مقابلے کے لیے احتیاطی تدابیر میں فروگزاشت نہ کرے ۔

دنیا کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام زمان و مکان کے حدود سے بالاتر پیغام کا نام ہے ۔ اس کے دروازے ابدی طور پر ہر بشر کے لیے پاٹوں پاٹ کھلے ہوئے ہیں ۔ وہ دنیا کی ہر فرد اور ہر جماعت کو اپنے دائرۂ ہدایت میں آنے کی دعوت دے رہا ہے ۔ اسلام کوئی ساکن اور جامد مذہب نہیں ہے ۔ وہ ایک متحرک تبلیغی مشن ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس کے دائرۂ اثر میں آنے والے اپنی منظم اور مرتب زندگی کو بگاڑ کر ایک نئے دورِ حیات میں قدم رکھتے ہیں ۔ اس تازہ داخلی خارج کی وجہ سے ان کے معاشی اور اقتصادی حالات کا دگرگوں ہو جانا ضروری ہے ۔ اسلام مجبور ہے کہ خمس و زکاۃ کے قانون کو دائمی اور مستمر قرار دے ۔ وہ اس کے توسل سے اپنے دائرۂ ہدایت میں داخل ہونے والوں کی اقتصادی حالت پر قابو پا کر انھیں تدریجاً اس مثالی معیار پر لانا چاہتا ہے جہاں عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں مسلمان نظر آتے ہیں ۔

ہر شخص دوسرے کے ساتھ بھلائی کر سکتا ہے

انسان مدنی الطبع اور فطری طور سے اجتماع پسند ہونے کی ضروریاتِ زندگی کی

فراہمی میں تعاون اور امدادِ باہمی کا محتاج ہے۔ امدادِ باہمی معاشرے کے افراد کے درمیان الفت و یگانگی اور اخلاص و مروت کے متبادل جذبات کی طالب ہے۔ ان جذبات کی پرورش از خود نہیں ہو سکتی بلکہ وہ مخصوص اسباب و وسائل کی مرہونِ منت ہے۔ جذبات، اخوت، مروت کے پیدا کرنے میں ایثار و احسان کی مدخلیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ حسنِ سلوک دشمنوں کے دلوں کو موم کر لیتا ہے۔ انسان کے ضمیر کا دباؤ قلب کو مجبور کر کے محسن کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ احسان و ایثار کا تعلق اموال اور غیر اموال ہر شے سے ہو سکتا ہے۔ حسنِ سلوک کے دائرے میں بڑی وسعت ہے۔ اسی گنجائش نے اس کا تبادلہ ہر شخص کے لیے ممکن بنا دیا ہے۔ امیر و فقیر کی طبقاتی تفریق اس بارے میں بالکل اثر انداز نہیں ہے۔ احسان و ایثار کا دروازہ ہر حساس اور شریف انسان کے لیے کھلا ہوا ہے۔ قانونِ حکومت کی تحریک اور دباؤ سے مالی یا غیر مالی حسنِ سلوک میں احسان کا کوئی نشان نہیں ہے۔

خمس و زکاۃ چونکہ حکومتِ اسلامی کا عائد کردہ آئینی ٹیکس ہے، اس لیے اس کی ادائیگی ہرگز فقرا کے دل میں اغنیا کے لیے جذباتِ محبت و اخلاص کی تربیت نہیں کرے گی۔ اسلام انسان کے نفس کی گہرائیوں میں اٹھنے والی تمام نزاکتوں سے باخبر تھا، اسی لیے اسلام نے خمس و زکاۃ کے علاوہ مطلقاً انفاق فی سبیل اللہ کو مستحب اور مستحسن قرار دیا ہے، مستطیع اور مال دار اشخاص کو بڑے زور و شور سے اس کی طرف رغبت دلائی ہے۔ خود قرآن اور اس کے ترجمان پیغمبرِ اسلامؐ نے تبرعات اور خیر خیرات کی جانب اپنے ماننے والوں کو برابر متوجہ کیا ہے۔

اسلام چونکہ اس فضیلت سے امیر و غریب دونوں کو نوازنا چاہتا تھا، لہذا اس نے نیکی اور بھلائی کرنے کے حدود میں بہت وسعت پیدا کر دی، ہر اچھے کام اور اچھی بات کو صدقہ قرار دے کر اس کے لیے اجر و ثواب کا وعدہ کر لیا۔

گزشتہ تشریحات کی روشنی میں یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ اپنوں یا غیروں کے ساتھ احسان کرنے میں ان کی تذلیل نہیں ہے، اس کے برخلاف وہ تالیفِ قلب

اور جذباتِ محبت و اخلاق کی زیادتی کا سبب ہے۔ ذلت و حقارت کا احساس یک طرفہ حسنِ سلوک کی صورت میں ہوتا ہے، دوطرفہ حسنِ سلوک میں نہیں۔ اسلام نے اس سلوک کو صرف اموال کے دائرے میں محدود نہ کر کے تہی دست افراد کے لیے تبادلۂ احسان کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر احسان احساسِ کم تری پیدا کرتا ہے تو محض اس وقت کہ جب کسی کو کوئی چیز یا روپیہ پیسہ صدقے کے نام سے دیا جائے۔ اسلام نے خیرات کے لیے کوئی خاص راستہ معین نہیں کیا ہے۔ صدقے کے نام سے ہٹ کر حسنِ سلوک کی اور بہت سی شکلیں بھی ہو سکتی ہیں۔ ضرورت مند اشخاص کے تحفظ کی خاطر کیا یہ ممکن نہیں کہ احسان کو تحفے اور ہدیے کا لباس پہنا دیا جائے؟

اس حقیقت کو ذہن میں اچھی طرح راسخ کرنے کی غرض سے پھر دہرایا جاتا ہے کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کی معاشی زندگی کو مال داروں کے رحم و کرم سے ہرگز وابستہ نہیں قرار دیا ہے۔ خمس و زکاۃ کو اس نے حکومت کا واجب الادا قانونی ٹیکس قرار دے کر ضرورت مند افراد کی گزر بسر کی ذمے داری اپنے سر لے لی ہے۔ اگر حکومت کسی طبقے کی کفالت کو براہِ راست یا بالواسطہ اپنے ذمے لے لے تو اس طبقے کو احساسِ کم تری کس لیے ہو گا؟

تاریخ اسلام اور سیرتِ رسولؐ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ نظام اسلامی نے حکومت کو کامل اختیار دیا ہے کہ وہ قادر اور توانا افراد کے لیے وسیلۂ معاش کا انتظام کرے۔ ایک شخص نے پیغمبرِ اسلامؐ سے اپنے لیے ذریعۂ معاش پیدا کرنے میں مدد چاہی چونکہ وہ صحیح و سالم اور محنت و مشقت پر قادر تھا، اس لیے آنحضرتؐ نے اس کو ایک کلہاڑی اور ایک رسی عنایت فرمائی۔ ہدایت کی کہ ان دونوں چیزوں کی مدد سے جلانے کی لکڑی بازار میں لا کر فروخت کیا کرو۔ پھر فرمایا کہ چند روز کے بعد نتیجۂ عمل سے مجھے مطلع کرنا۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ایک ذاتی فعل تھا، اسے نظام اسلامی کا جز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ آج جبکہ بیسویں صدی میں دنیا بالکل

بدل چکی ہے، دست کاری کی جگہ مشینوں نے لے لی ہے، بڑے بڑے عظیم کارخانے قائم ہوگئے ہیں جن میں ہزاروں مزدور کام کر رہے ہیں ۔اس کے باوجود ہٹے کٹے اور مضبوط و طاقت ور لاکھوں آدمی، بے روزگاری اور بے کاری کا شکار ہو کر حیران و سرگرداں گھوم رہے ہیں ۔اس ایک کلہاڑی اور رسی کی کیا اہمیت ہے؟ یہ شبہ نہایت کمزور اور بے بنیاد ہے۔ کیا اس جہالت اور بے سروسامانی کے دور میں یہ ممکن تھا کہ رسول اللہ صلعم کارخانے اور فیکٹریاں قائم کرتے؟ کیا ان وسائل کے پیدا ہونے سے تیرہ سو برس پہلے یہ معقول تھا کہ پیغمبرؐ ان کے لیے تفصیل سے اصول و قواعد مرتب اور مدون کر جاتے؟ بالفرض اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علم غیب کی مدد سے ایسا کر بھی دیتے تو اس وقت کون تھا جو ان کے مفہوم کو سمجھ سکتا؟ ان حالات میں رسولؐ جتنا کر سکتے تھے، اس میں آپ نے فروگزاشت نہیں کی۔آپ کے منصب کا تقاضا تھا کہ اس خاص مسئلے میں کہ بے کاروں اور بے روزگاروں کے بارے میں حاکمِ شرع کی ذمے داری کیا ہے، آپ بنیادی طور پر قانونی ہدایات فرما دیں۔اس اجمالی اور بنیادی قانون کی تطبیق، جو حالاتِ زمانہ کے موافق و مناسب ہو، ہر دور کے علماؑ اور مجتہدین کا کام ہے۔

متذکرہ واقعہ اتنا ضرور بتاتا ہے کہ قانونِ اسلام کی رو سے حاکمِ شرع اس کا مجاز ہے کہ وہ قادر و توانا مستحقین کی عارضی امداد روک کر ان کے واسطے ایسا مستقل وسیلہ معاش مہیا کر دے جس سے وہ محنت کر کے اپنی گزر بسر کرتے رہیں۔اس واقعے میں رسولؐ نے اس شخص سے یہ بھی فرمایا کہ بعد میں آکر اپنے نتیجۂ عمل سے مجھے مطلع کرنا۔اس کے معنی یہ ہیں کہ صاحبانِ احتیاج کے لیے سامانِ معیشت مہیا کرنے کی جو ذمے داری حاکمِ شرع پر قانوناً عائد ہوتی ہے، رسولؐ پوری طرح اس سے سبک دوش ہونا چاہتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں میں حاجت مند افراد کے دو طبقے ہوں گے ایک وہ گروہ جس کے ہاتھ پیروں میں جان ہے، وہ کام کر کے اپنا پیٹ پال سکتا ہے۔

دوسری وہ جماعت جو کسی وجہ سے محنت و مشقت پر قادر نہیں ہے۔ اسلام نے ان دونوں طبقوں کا اصل کفیل اپنی حکومت کو قرار دیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دوسرا طبقہ کہ جو عاجز ہے، وہ اطمینان سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا اور حکومتِ اسلامی برابر اس کے ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرتی رہے گی۔ رہ گیا پہلا گروہ، اس کے متعلق اسلام حاکم شرع کو مکمل اختیار دیتا ہے کہ وہ انھیں مفت کھانے کے لیے نہ دے، بلکہ ان کے واسطے کوئی ایسا وسیلہ معاش مہیا کر دے جو محنت و مشقت کے ساتھ ان کی گزر بسر کے لیے کافی ہو۔

غدیرِ خم

پروفیسر سید مظفر حسن ظفر جون پوری مدظلہ

سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۳ میں نصف کے بعد ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت
لکم الاسلام دیناً [۱]

آج میں نے تمھارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری
کر دی اور تمھارے لیے "اسلام" کو بطورِ دین کے پسند کر لیا۔

حجۃ الوداع کی واپسی پر جب پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسبِ ارشادِ خداوندی کارِ رسالت کا حق بکمال ہوش مندی واحتیاط اس وقت کے تمام ذرائع ابلاغ کو کام میں لاتے ہوئے اعلانِ ولایتِ علی علیہ السلام کر کے ادا کر دیا تو بطورِ سند مذکورۂ بالا آیت نازل ہوئی، یعنی دین عظمت و سربلندی اور تکمیلِ احکام و قواعد کے لحاظ سے کامل ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں نعمتوں کا اتمام ہوا اور اسلام مکمل ضابطۂ حیات کی صورت میں مجسم دین بن گیا۔ گویا اب کوئی نیا حکم نازل نہ ہوگا، بلکہ قرآنی اصول کی روشنی میں تطبیق کے گوشے بے نقاب کیے جائیں گے۔ نبوت و رسالت پر خاتمیت کی مہر لگنے کے بعد دورِ امامت شروع ہوگا جس کا منصبی فرض ہوگا حفاظتِ دین اور یہ سلسلہ دامنِ قیامت سے مل جائے گا اس طرح کہ امامِ دوازدہم عجل اللہ فرجہ حکمِ خدا سے پردۂ غیب میں رہ کر بذریعۂ اعلم دوران عہد بعہد ہدایت کے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ مذکورۂ بالا آیت پر "تفسیرِ فرات ابن ابراہیم کوفی" میں یوں روشنی ڈالی گئی

ہے:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم یوم غدیر خم افضل اعیاد امتی ،ھو الیوم الذی امر نی اللّٰہ تعالیٰ ذکرہ بنصب اخی علی بن ابی طالب علماً لامتی یھتدون بہ من بعدی و ھو الیوم الذی اکمل اللّٰہ فیہ الدین ،و اتم علیٰ امتی فیہ النعمۃ و رضی لھم الاسلام دیناً۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ غدیرِ خم کا دن میری امت کی تمام عیدوں سے افضل ہے ۔یہ وہ دن ہے جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے بھائی علیؑ ابن ابی طالب کو میری اپنی امت کے لیے رہنما مقرر کرنے کا حکم دیا تاکہ لوگ میرے بعد ان سے ہدایت حاصل کریں ، اوریہی وہ دن ہے جب اللہ نے دین کو کامل کیا اور اسی دن میری امت کے لیے نعمتوں کو تمام کیا اور ان کے لیے اسلام کو بطورِ دین پسند کیا۔

فرات بن ابراہیم کوفی کے بارے میں سید العلماؑ مولانا سید علی نقی صاحب مجتہد نے اپنی کتاب " مقدمۂ تفسیرِ قرآن "، مطبوعہ ادارۂ علمیہ (پاکستان) لاہور کے صفحہ ۵۴ پر لکھا ہے:

" فرات بن ابراہیم کوفی یہ بھی بالکل اسی زمانے میں تھے ، شیخ علی بن بابویہ نے ان سے بھی احادیث اخذ کیے تھے ۔ان کی تفسیر زیادہ تر ان احادیث کے مضامین پر مشتمل ہے جو ائمۂ معصومین کے فضائل و مناقب میں وارد ہیں ۔ علامہ مجلسیؒ نے بحار میں لکھا ہے کہ تفسیرِ فرات بن ابراہیم کے متعلق اگرچہ علمائُ نے کوئی اظہارِ خیال نہیں کیا ہے ، لیکن اس کے احادیث کا ان اخبار کے مطابق ہونا جو ہمیں دوسرے ذرائع سے ائمۂ معصومین کی جانب سے پہنچے ہیں ، اس کے

مصنف کے وثاقت واعتبار کے شاہد ہیں ۔اس عبارت کے پیش نظر
مذکورۂ بالا حدیث کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے اور حضورؐ کا یہ ارشاد
فرمانا کہ 'غدیرِ خم کا دن میری امت کی تمام عیدوں سے افضل ہے'
مومنین کے دل کو نہ ختم ہونے والی تقویت بخشتا ہے"۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگرچہ رضائے الہیٰ کی خاطر اپنے وطن یعنی مکے کو چھوڑا تھا اور مدینے کو آباد کیا تھا، لیکن فطری تقاضے کی بنا پر وطن کی یاد ستاتی رہتی تھی ۔ کیوں نہ ہو! آخر وطن وطن ہے اور سفر سفر ہے، چنانچہ جب حج فرض کیا گیا تو حضورؐ کے دل کی کلی کھل اٹھی اور آپ نے اس فریضے کے بجالانے کی تیاری شروع کردی ۔ شوق کا یہ اصرار تھا کہ وقت اپنا دامن سمیٹ لے تا کہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوجائیں ۔

حضورؐ کا قصدِ حج جب صاحبانِ ایمان کو معلوم ہوا تو وہ (۱) محبتِ رسولؐ اور (۲) فریضۂ حج کی ادائیگی کی دوہری سعادت حاصل کرنے کی غرض سے پروانہ وار مدینے کی سمت دوڑ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مدینے کے اطراف میں ایک لاکھ سے زیادہ کا مجمع ہو گیا اور ہر جانب خیمے ہی خیمے نظر آنے لگے ۔

۲۵ ویں ذوالقعدہ، ۱۰ھ کو حضورؐ پاکیزہ اور عطر آگیں فضا میں نمازِ ظہر ادا کرنے کے بعد اپنے خاندان کو لیے مدینے کے باہر آئے اور جاں نثاروں کے عظیم الشان و عظیم المرتبت قافلے کو ساتھ لے کر مکۂ معظمہ کی طرف روانہ ہوئے، ایسا قافلہ چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ قافلہ سالارؐ انبیا و رسل کا سید و سردار اور قافلے والے پاک دل اور پاک باطن، تعداد میں لاکھ سے زیادہ اور اتباعِ قافلہ سالار میں یک جان و یک دل لبیک اللھم لبیک کی گونج دشت و در، کوہ و بیاباں کو نغمۂ توحید سے سرشار کرتی ہوئی۔

اس وقت حضرتِ علیؑ یمن میں تھے، چنانچہ آپ بھی بغرض حج مکے میں آئے، تنہا نہیں بلکہ حج کرنے والوں کا ایک بہت بڑا قافلہ لے کر۔ یہ دونوں قافلے جب یک جا

ہوئے تو شان و شوکت دیکھنے کے قابل تھی۔

حضورؐ نے جو راستہ اختیار کیا اور جہاں جہاں قیام کیا، تاریخ نے سب کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا ہے۔ یلملم، شرف السیالۃ، عرق انطبیہ، الروحا، منصرف، متعشّی، اثابہ، منزل عرج، لحی جمل، سقیا، ابوا، جحفہ، قدید، عفان، مرالظہران، سرف، ان سب کو یہ شرف حاصل ہوا کہ یہاں کے ذروں نے ان قافلے والوں کے قدم چومے جن کا قافلہ سالار وہ تھا جس کے لیے اللہ نے کائنات خلق کی۔ اللہ کے ان مقدس بندوں کو محبتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فریضۂ حج ادا کرنے کی وہ سعادت نصیب ہوئی جو ان کے لیے ہمیشہ سرمایۂ افتخار رہی۔ حضورؐ نے دورانِ سفر کئی خطبے دیے جنھیں سن سن کر ایمان میں تازگی اور شگفتگی آئی۔ انھیں خطبوں میں ایک خطبہ وہ بھی ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا:

> انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ و عترتی اھل بیتی۔ ما ان تمسکتم بھما لن تضلو بعدی۔ و انھما لن یفترقا حتیٰ یرد علی الحوض۔
>
> یعنی میں تمھارے درمیان دو گراں بہا چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، اللہ کی کتاب اور اپنی عترت (یعنی) میرے اپنے اہل بیتؑ۔ جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہو گے، میرے بعد گمراہ نہیں ہو گے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر مجھ سے آملیں گے۔

اللہ کے آخری نبیؐ و رسولؐ نے صاف صاف بتا دیا کہ اسلام کی تازگی اور ایمان کی پختگی کے لیے ضروری ہے کہ قرآن اور اہل بیت سے وابستگی برقرار رہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ایمان کی خیر نہیں۔ صرف قرآن یا صرف اہل بیتؑ سے تعلق کام نہیں دے گا اور یہ طرزِ عمل اللہ کے آخری رسولؐ کی مخالفت پر مبنی ہو گا۔

حضورؐ جب حج کے لیے روانہ ہوئے تھے تو مسلمانوں کی بڑی کثیر تعداد آپؐ کے ساتھ تھی، اور جب مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد آپؐ لوٹے ہیں تو لوگوں کی تعداد میں ہزاروں کا اضافہ ہوا، گویا عظمت و جلالت نے اللہ کی شان کا زبان حال سے اعتراف کیا۔

یہ قافلہ گردشِ دوراں کو روندتا ہوا لوٹ رہا تھا کہ پیغمبرِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وقفے وقفے سے وحی کا نزول ہوا۔

یایھا الرسول بلغ مآ انزل الیک من ربکؕ و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہؕ و اللّٰہ یعصمک من الناسؕ ان اللّٰہ لا یھدی القوم الکفرینo

(سورۃ المائدہ، آیت ۶۷)

اے رسول! پہنچا دو وہ سب جو تم پر تمھارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کے پیغام کو پہنچایا ہی نہیں اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔ یقیناً اللہ کافر لوگوں کو راہ نہ دے گا۔

خطاب کتنا بلیغ ہے! رسول کہہ کر مخاطب کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد تاکید کی جا رہی ہے کہ جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے، اسے پہنچا دو۔ کوئی صراحت نہیں ہے اور صراحت کی ضرورت بھی کیا تھی، کیونکہ جس سے خطاب کیا گیا ہے، وہ بخوبی واقف ہے پھر مزید تاکید یہ کہہ کر کی گئی کہ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو کارِ رسالت ہی انجام نہیں دیا اس کے بعد حفاظت کی ذمے داری خداوندِ عالم نے اپنے سر لی اور آیت کے آخر میں یہ قاعدۂ کلیہ بیان کیا گیا کہ یقیناً اللہ کافروں کو راہ نہیں دیتا۔

اسی طرح کی آیتیں قرآن حکیم میں جابجا ہیں کہ جہاں شانِ نزول جانے بغیر بات سمجھ میں نہیں آتی اور شانِ نزول کا علم سب سے زیادہ حضورؐ کو تھا۔ آپؐ ختم الرسل تھے اور قرآن حکیم آپؐ کی رسالت کا ایسا دائمی معجزہ تھا جسے قیامت تک باقی رہنا تھا، یا

پھر شانِ نزول سے واقفیت ان کو تھی جو آپؐ کے اہل بیتؑ تھے اور آپؐ کی تبلیغی سرگرمیوں میں دل و جان سے شریک تھے۔ ان کے علاوہ شانِ نزول سے وہ لوگ بھی واقف تھے جو ان کے دامن سے وابستہ تھے۔ رہے وہ لوگ جو اہلِ بیتؑ سے احادیث لینا نہیں چاہتے تھے، ان کا علم اس سلسلے میں ناقابلِ اعتبار تھا، ان کی نیت صاف نہیں تھی، ورنہ اہلِ بیتؑ سے دور نہ بھاگتے۔ وہ اپنا قبلہ الگ بنانا چاہتے تھے، اسی لیے آیۂ بلغ کی تفسیر میں معتبر روایت وہی ہے جو باوثوق ذریعے سے امتِ مسلمہ تک پہنچی۔

علامہ سید محمد حسین طباطبائی طاب ثراہ کی مشہور و معروف تفسیر "المیزان فی تفسیرِ القرآن"، جلد ششم، صفحہ ۵۹ کا آزاد ترجمہ اختصار کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ "فتح القدیر" میں ابنِ مسعود کے بیان کے مطابق یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک ؕ کے بعد تفسیری فقرہ یوں ہے: ان علیا مولی المومنین یعنی "بے شک علیؑ مومنین کے مولا ہیں"۔ آگے بڑھ کر صاحبِ تفسیر مذکور لکھتے ہیں کہ یہ چند حدیثیں یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک ؕ سے متعلق علیؑ کے حق میں ہیں۔ اور حدیثِ غدیر، یعنی من کنت مولاہ فعلیؑ مولاہ یعنی "جس کا میں مولا ہوں، اس کے علیؑ مولا ہیں"۔ حدیث متواتر ہے اور شیعہ و اہلِ سنت، دونوں کے طریقوں سے مروی ہے اور یہ طریقے سو سے بھی زیادہ ہیں۔ اس کی روایت صحابۂ کرامؓ کے بڑے گروہ نے کی ہے، مثلاً البرؓا ابن عازب، زیدؓ بن ارقم، ابو ایوبؓ انصاری، عمرؓ بن خطاب، علیؓ ابنِ ابی طالب، سلمانؓ فارسی، ابو ذرؓ غفاری، عمارؓ ابنِ یاسر، بریدہؓ، سعدؓ ابنِ وقاص، عبداللہؓ ابنِ عباس، ابوہریرہؓ، جابرؓ ابنِ عبداللہ، ابو سعیدؓ الخدری، انسؓ بن مالک، عمرانؓ ابنِ الحصین، ابنِ ابیؓ اوفیٰ، سعدانہؓ، زوجۂ زیدؓ بن ارقم۔ یہ فہرست بتاتی ہے کہ حجۃ الوداع کی واپسی پر حضورؐ نے مقامِ غدیرِ خم پر اللہ کے حکم کی بجاآوری کتنی دل جمعی اور کتنے اہتمام سے کی۔

مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد حضورؐ جب غدیرِ خم پر پہنچے تو وحیِ الہیٰ کے مطابق "تبلیغِ رسالت" کا فریضہ انجام دینے کے لیے لائحۂ عمل مرتب کیا۔ غدیرِ خم کا جائے وقوع

ایسا ہے کہ مکے کی واپسی پر سارے قافلے کو یہاں تک آنا پڑتا ہے، پھر یہاں سے مصر، بصرے، کوفے اور مدینے جانے کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ یہ مقام جحفہ کے حدود میں ہے۔

یہ قافلہ جب مکے سے واپس ہوا تھا تو حاجیوں کی بڑی تعدا آگے آگے تھی۔ حضورؐ اور ان کے ساتھ چلنے والے درمیان میں تھے اور آخر میں پھر حاجیوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ حضور غدیرِ خم پر ٹھہر گئے۔ جو لوگ آگے نکل گئے تھے، انھیں تیز رفتار قاصدوں کو بھیج کر واپس بلایا اور جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے، ان کا انتظار کیا۔ اس مقام پر ببول کے پانچ بڑے درخت تھے۔ آپ نے نے فرمایا کہ ان کے نیچے کوئی نہ بیٹھے۔ جاں نثاروں نے ارشادِ پیغمبرؐ پر عمل کیا۔ ان درختوں کے نیچے کی زمین خس و خاشاک سے پاک کی گئی، آس پاس کی زمین کو بھی جھاڑا گیا۔ اتنے میں ظہر کا وقت آچکا تھا۔ فضا میں اذان گونجی۔ حضورؐ ان درختوں کے نیچے تشریف لائے، نمازِ ظہر کی امامت کی۔ ایک لاکھ سے زیادہ فرزندانِ توحید نے آپؐ کے پیچھے نماز پڑھی۔ دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے لوگوں نے اپنی اپنی چادر کا کچھ حصہ سر پر ڈال رکھا تھا اور کچھ زمین پر بچھالیا تھا۔ حضورؐ کو آفتاب کی تمازت سے بچنے کے لیے لوگوں نے ببول کی شاخوں پر ایک چادر تان دی تھی۔ نماز کے بعد آپ اس جانب بڑھے جہاں اونٹ کے کجاووں کو تلے اوپر رکھ کر ایک عظیم الشان اور فقید المثال منبر بنایا گیا تھا۔ یہ منبر بیچ میں تھا اور مجمع چاروں طرف۔ حضورؐ پیغمبرانہ جاہ و جلال کے ساتھ منبر پر جلوہ افروز ہوئے، ایک نگاہ پورے مجمع پر ڈالی اور فصیح و بلیغ خطبے کا آغاز کیا۔ پہلے حمد و ثنا کے موتی بکھیرے، پھر زبانِ وحی ترجمان سے ارشاد فرمایا، "لوگو! میں عنقریب بارگاہِ ایزدی میں بلایا جانے والا ہوں اور میں چلا جاؤں گا۔ مجھ سے بھی باز پرس ہوگی اور تم سے بھی۔ بتاؤ! تم کیا جواب دو گے؟" سب نے یک زبان ہو کر کہا، "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے تبلیغِ رسالت اور ہماری خیر خواہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ خدا آپ کا بھلا کرے!" اس کے بعد پھر آپؐ لب کشا ہوئے، "کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں؟ اور یہ کہ محمدؐ اس کا

عبد اور رسول ہے؟ اور یہ کہ جنت، دوزخ اور موت حق ہیں؟ اور یہ کہ قیامت آکر رہے گی، اس میں کوئی شک نہیں؟ اور یہ کہ خداوندِ عالم سب کو قبروں سے اٹھائے گا؟"
پورے مجمع نے کہا، "ہم ان سب کی شہادت دیتے ہیں"۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا، "اللہ! تو گواہ رہنا"۔ پھر حضورؐ گویا ہوئے، "ایک بات غور سے سنو!" مجمع نے کہا، "ارشاد ہو"۔
آپؐ نے فرمایا، "میں حوضِ کوثر پر تمھارا منتظر رہوں گا اور تم لوگ حوضِ کوثر پر مجھ سے ملو گے۔ وہاں چاندی کے پیالے ستاروں کی تعداد کے مطابق ہوں گے۔ اس کا خیال رکھنا کہ میرے ثقلین کے ساتھ تمھارا کیسا برتاؤ ہے"۔ کسی نے پوچھا، "ثقلین سے کیا مراد ہے"؟ آپؐ نے کہا، "'ثقل اکبر' اللہ کی کتاب ہے جس کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے، دوسرا تمھارے پاس ہے۔ اس تمسک کو قائم رکھنا ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔ اور 'ثقل اصغر' میری عترت ہے۔ مجھے خدائے لطیف و خبیر نے بتایا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر مجھ سے آملیں گے۔ تم ان دونوں سے الگ نہ ہونا اور نہ ان کی حق تلفی کرنا، ورنہ گمراہ اور ہلاک ہو جاؤ گے"۔
اس عظیم الشان تمہید کے بعد آپؐ نے علیؑ کو پاس بلایا، مضبوطی سے ان کے بازو پکڑے اور انھیں اتنا بلند کیا کہ سفیدیٔ بغل دکھائی دینے لگی۔ دیکھنے والوں نے یہ منظر دیکھا کہ رسولؐ اللہ، علیؑ کو اس طرح اٹھائے ہوئے ہیں کہ صرف علیؑ دکھائی دے رہے ہیں اور حضورؐ کا سراپا ان کے پیچھے ہے۔
علمائے نفسیات کا یہ کہنا ہے کہ یاد رکھنے کے لیے مشاہدہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس کے ساتھ اگر قوتِ سماعت شامل ہو جائے تو حافظے کو اور تقویت حاصل ہوتی ہے اس کے آگے کا درجہ دل کی طلب ہے جس کی اثرانگیزی کی حد متعین نہیں کی جا سکتی۔ قرآن حکیم میں سمع، بصر اور فواد کا ذکر ہے جو اسی مفہوم کو اور بہتر طریقے سے پیش کرتا ہے۔ اب غدیرِ خم کا منظر چشمِ تصور سے دیکھیے۔ پورا نظارہ فردوس نظر ہے۔ آنکھوں کو معراج مل رہی ہے۔ حضورؐ کی آواز دل کی گہرائی میں اتر کر قوتِ سماعت میں رس گھول رہی ہے۔ اسی مجمع میں وہ لوگ بھی ہیں جن کے دل کی دھڑکن میں مودت کا آہنگ

شامل ہے ۔ ان عوامل کے علاوہ جگہ کے انتخاب میں انفرادیت ہے ۔ منبر کی شان دوسرے منبروں سے ممتاز ہے ۔ اندازِ تخاطب غذائے روح بنتا جارہا ہے، پیش کش نئی ہے ۔ کیا ایسا انتظام و اہتمام کسی اور موقع پر ہوا؟ تاریخ دم بخود ہے ۔ حضورِ اکرم نے رسالت کا حق ادا کر دیا اور ہر طرح کی حجت تمام کر دی ۔ اس کے بعد بھی کوئی شک کرے تو اس کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہیں ۔

علیؑ کو بلند کر کے اللہ کا رسول کہتا ہے، " ایھا الناس، تم لوگوں میں سے وہ کون ہے جو مومنوں کا ان کے نفسوں سے بھی زیادہ مالک ہے؟ " انھوں نے کہا، " اس کو اللہ جانتا ہے اور اس کا رسولؐ " ۔ حضورؐ نے فرمایا، " اللہ میرا مولا ہے اور میں مومنوں کا مولا ہوں، اور میں ہی ان کے نفسوں سے زیادہ ان پر حقِ ملکیت رکھتا ہوں " ۔ اس کے بعد آپ نے فوراً ہی، بغیر فصل کے فرمایا، من کنت مولاہ فعلی مولاہ " پس جس کا مولا میں ہوں، اس کے مولا علیؑ ہیں " ۔ آپؐ نے اس فقرے کو تین مرتبہ دہرایا اور احمدؒ ابن حنبل کی روایت میں ہے کہ چار مرتبہ دہرایا ۔ اب آپ یہاں ٹھہر کر سارے واقعات کو، جو روانگی مدینہ سے شروع ہوئے ہیں اور من کنت مولاہ فعلی مولاہ کی ادئیگی تک پہنچے ہیں، دل میں دہرالیئے، آیت کی شان پر نظر ڈالیے ۔ اللہ کے رسولؐ کا انہماک دیکھیے! لوگوں کو پاس بلوا رہے ہیں، پیچھے رہنے والوں کا انتظار کر رہے ہیں، ماحول کو شریکِ حال بنا رہے ہیں، پیغام رسانی کے تمام موجودہ عوامل بروئے کار لا رہے ہیں ۔ کیا کوئی کسر باقی رہ گئی؟ نہیں! ہرگز نہیں!

غدیرِ خم میں ہے اس شان سے اسلام کا بانی
ادائے فرض کے جلووں سے ہے پر نور پیشانی

اعلان ولایت کے بعد حضورؐ کے دل سے یہ دعائیں نکلیں: " اے اللہ! دوست رکھ اس کو جو اس کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اس کو جو اس کو دشمن رکھے؛ محبت کر اس سے جو اس سے محبت رکھے اور بغض رکھ اس سے جو اس سے بغض رکھے؛ اور مدد کر اس کی جو اس کی مدد کرے؛ اور ذلیل کر اس کو جو اس کو ذلیل کرے اور حق کو اس

طرف پھیر جدھر جدھر یہ پھرے"۔

اس دعا کے بعد آپؐ نے فرمایا: "جو یہاں ہیں، ان کا فرض ہے کہ میرے اس پیغام کو ان تک پہنچائیں جو یہاں نہیں ہیں"۔

حضورؐ کے دہنِ اقدس سے نکلی ہوئی دعائیں مستجاب ہوئیں یا نہیں؟ اگر مستجاب ہوئیں تو اللہ نے علیؑ کو دوست رکھا، ان کے دشمن کو دشمن سمجھا اور یہ بات کتنی عظیم ہوئی۔ اور اگر یہ دعائیں مستجاب نہیں ہوئیں تو اللہ کے رسولؐ کی کتنی توہین ہوئی، اور اللہ کا وہ رسولؐ جو اللہ کا محبوب بھی ہے۔ اس کے بعد وہ آیت نازل ہوئی جس کا ذکر شروع میں آچکا ہے۔

اب حضورِ اکرمؐ نے تمام لوگوں سے کہا کہ جا کر علیؑ کو ولایت کی مبارک باد دو۔ اس کام کے لیے آپؐ نے ایک خیمہ نصب کرا دیا تھا جس میں علیؑ جا کر بیٹھے اور لوگوں نے ان کو آکر مبارک باد دی۔ لوگ مبارک باد دے رہے تھے کہ "اے فرزندِ ابو طالب! مبارک ہو کہ آپ ہر مومن اور ہر مومنہ کے مولا ہو گئے"۔ اس موقع پر حضورؐ سے اجازت لے کر حسان بن ثابت نے تہنیتی قصیدہ پڑھا۔ یہاں تک تو سارے کام بخیر و خوبی انجام تک پہنچے، لیکن بعد میں کیا ہوا، اس پر امام جعفر صادق علیہ السلام کی حسبِ ذیل حدیث روشنی ڈالتی ہے۔ آپؑ نے فرمایا، "لوگوں کو دو گواہوں سے حق مل جایا کرتا ہے، لیکن علیؑ کو ایک لاکھ چوبیس ہزار گواہوں کے باوجود یہ حق نہ مل سکا"۔

حدیثِ غدیر کو صحابۂ مبارک میں سے ایک سو دس صحابہ نے نقل کیا۔ صحابہ اور تابعین کے بعد ہر دور کے اکابر علمائے نے اسے نقل کیا۔ پہلی صدی تو صحابہ اور تابعین کی تھی، دوسری صدی میں چھپن، تیسری صدی میں بانوے، چوتھی صدی میں تینتالیس پانچویں صدی میں چوبیس، چھٹی صدی میں اکیس، ساتویں صدی میں اکیس، آٹھویں صدی میں دس، نویں صدی میں سولہ، دسویں صدی میں چودہ، گیارھویں صدی میں بارہ، بارھویں صدی میں چودہ، تیرھویں صدی میں گیارہ، چودھویں صدی میں گیارہ

جلیل القدر علمائے اس کی توثیق کی ہے۔ان سب کی تعداد کو اگر جوڑا جائے تو صحابہ و تابعین کے بعد تین سو ساٹھ تک تعداد پہنچ جاتی ہے۔ حدیثِ غدیر پر یوں تو بہت سی کتابیں لکھی گئیں، مگر عبدالحسین احمد الامینی النجفی کی تالیف الغدیر فی الکتاب و السنۃ والادب کا جواب نہیں۔ یہ کتاب دینی، علمی، فنی، تاریخی، ادبی، اخلاقی ہے۔ میرے علم کے مطابق اس کی گیارہ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ مولف نے عرق ریزی، ژرف نگاہی، تحقیق و جستجو اور حقیقت نگاری کا حق ادا کر دیا ہے اور حتیٰ الامکان کوئی گوشہ چھوڑا نہیں۔ الغدیر در حقیقت بحرِ ذخار ہے۔ غدیرِ خم ہمارا تشخص ہے۔ اس نے ہم کو اعلائے کلمۂ حق سکھایا، ہمارے دلوں سے سلطنت و حشمت کا خوف مٹایا ہے۔ ہم جتنا اسے دہرائیں گے، اتنی ہی پختہ مزاجی حاصل کر پائیں گے۔

دعوتِ ذوالعشیرہ سے لے کر غدیرِ خم تک حضورؐ نے علیؑ کا برابر تعارف کرایا اور کھلے لفظوں میں سب کو بتایا کہ یہ میرا جانشیں ہوگا، میرا نائب ہوگا، میرا وصی ہوگا۔ اور علیؑ نے بھی اپنے کردار سے ثابت کر دیا کہ ولایت کے منصب کے یہی مستحق ہیں۔ اپنی پیدائش سے لے کر حضورؐ کی وفات تک ہمیشہ ان کے ساتھ رہے اور ان کی خدمت کی سعادت حاصل کرتے رہے۔ کسبِ فیض اگر کوئی چیز ہے تو اس کو تسلیم کیجیے کہ علیؑ نے حضورؐ سے جتنا فیض کسب کیا، اتنا کوئی دوسرا نہ حاصل کر سکا۔ رہنے سہنے، نشست و برخاست، گفتگو و خاموشی، عبادات و معاملات، رزم و بزم، تقریر و تحریر، غرض زندگی کی معمولی سی معمولی بات میں جو کچھ علیؑ نے سیکھا ہے، وہ سب حضورؐ ہی سے سیکھا ہے۔

رسولؐ وقت کی رفتار کو بدلتے ہیں
علیؑ ملا کے قدم ساتھ ساتھ چلتے ہیں

اس کو کہتے ہیں اتباع، ایسی ہوتی ہے پیروی۔

پوچھنے والا اگر پوچھے کہ غدیرِ خم میں مرکزی کردار کس کا تھا تو اس کا جواب آسان نہیں ہوگا۔ دیکھیے اور غور کیجیے کہ حضورؐ کو تبلیغِ رسالت کی سند لینی ہے اور علیؑ

کو امامِ اولیں، ولی، وصی رسولؐ ہونا ہے۔اہتمام کر رہا ہے اللہ کا رسولؐ، جس کے لیے اہتمام ہو رہا ہے، وہ علیؑ کی ذات ہے۔ ادھر خدمتِ نبوت کا سلسلہ ہے، ادھر ابتدائے امامت کی بات ہے؛ ادھر تبلیغ کو کمال حاصل ہوا ہے، ادھر کارِ حفاظتِ دیں کا آغاز ہے۔ایک دروازہ بند ہو رہا ہے اور ایک دروازہ کھل رہا ہے، گویا مرکزی حیثیت مشترک ہے۔

حضورؐ کا یہ پہلا اور آخری حج تھا۔علیؑ حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔اب حضورؐ کی زندگی کا دور ختم ہونے والا ہے اور علیؑ بالفعل جانشین رسولؐ ہونے والے ہیں۔

غدیرِ خم کے بعد کا ماحول بوجھل ہوتا جا رہا ہے۔لوگ علیؑ سے واقف ہیں۔علیؑ سمجھتے ہیں کہ زمانہ کروٹ لے چکا ہے، خیالات بدلتے جا رہے ہیں۔رسولؐ کے ساتھ علیؑ تھے، علیؑ کے ساتھ رسولؐ علیؑ جیسا بلکہ ان کا عشرِ عشیر بھی کوئی نہیں۔علیؑ کو تنہائی کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔اقتدار میں وہ لوگ ہیں جو علیؑ کی باتوں کو مانتے نہیں۔دین کے محاذ پر علیؑ ہیں جن کے ساتھ لوگ چل نہیں سکتے۔ کتنی سخت اور دشوار گزار منزل ہے! لیکن علیؑ نے تمام دشواریوں پر قابو حاصل کیا۔فرار کا لفظ ان کی لغت میں نہیں تھا وہ ڈٹے رہے اور دین کی خدمت کرتے رہے۔

غدیرِ خم نے زمانے کو یہی پیغام دیا کہ حق کا بول بالا رہتا ہے، اسے کبھی شکست کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔حضورؐ تبلیغِ رسالت میں کلیتہً کامیاب رہے اور آپؐ نے اپنے کام کو ادھورا نہیں چھوڑا۔قرآن حکیم کو مرتب کیا اور اپنا جانشین مقرر کیا، اسی لیے تو لبِ قدرت پر آیا کہ آج کے دن دین کامل ہوا، نعمتیں تمام ہوئیں اور اسلام بطورِ دین خدا کی نظروں میں پسندیدہ ہوا۔

کتابیات

۱) تفسیرِ انوار النجف (حسین بخش صاحب قبلہ) ۲) المیزان، جلدِ ششم (علامہ سید محمد حسین طباطبائی طاب ثراہ)

۳) الغدیر، جلدِ اول (عبد الحسین احمد الامینی النجفی) ۴) منتہی الامال، جلدِ اول (شیخ عباس قمی طاب ثراہ)

۵) مقدمۂ تفسیرِ قرآن (مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ) ۶) کتابچہ غدیرِ خم (مولانا سید ابنِ حسن نجفی)

انا مدینة العلم و علی بابھا (حدیثِ رسولؐ)

آثار و افکار اکادمی پاکستان

کے

اغراض و مقاصد

۱۔ ہر سال ملک میں شائع ہونے والی اپنے علماٗ اور اہل قلم کی بہترین کتاب یا کتابوں پر نقد انعام دینا۔

۲۔ ایسا لٹریچر شائع کرنا جس سے اتحاد بین المسلمین کے فروغ میں مدد دی جاسکے۔

۳۔ گزشتہ علماٗ کی ایسی علمی اور دینی کتابیں شائع کرنا جو کسی وجہ سے اب تک شائع نہیں ہو سکیں یا اب دستیاب نہیں ہیں مگر اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے ان کی اشاعت ضروری ہے، نیز اکادمی کی طرف سے حسبِ ضرورت کتابیں مرتب کرکے شائع کرنا۔

۴۔ قوم کے علماٗ، محققین اور دیگر اہل قلم کی وہ اہم، مفید اور معیاری تصانیف اور تخلیقات شائع کرنا یا شائع کرنے میں مدد دینا جو وسائل کی کمی کی وجہ سے شائع نہیں کی جاسکتیں۔

۵۔ قومی جرائد کو اعترافِ خدمات کے طور پر نقد رقوم پیش کرنا۔

رابطے کا پتہ:

آثار و افکار اکادمی

دانش منزل، 13 / A-44 ، گلشن اقبال، کراچی 75300

فون نمبر 4977726